

فہرست

۱۱	احسان
۲۶	عورت صاحبہ
۳۵	جُوتا
۳۵	اندھاں
۵۹	عالاں
۴۹	نیلا پھر
۶۹	بارٹر
۹۱	ایک عورت تین کھانیاں
۱۰۱	ایک احتمال نجت کی کھانی

قاسم کے نام

جو میرا عزیز بھی ہے اور ہم دونوں کا موضوع فن
بھی مشترک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرا ان
اسانے فیضی ہے اور اُس کا، فتوحگرانی —

گزارش

کسی بھی تخلیقی فن کار کے لئے موضوعات کبھی کتاب نہیں ہوتے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس موضوعات کم ہو رہے ہیں تو یہ کمی دراصل خود اس کے اندر ہوتی ہے۔ میرے ساتھ الیتیہ یہ ہے کہ میں لئے موضوعات کی کمی بھی محسوس نہیں کی، مگر میرے حالات نے مجھے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ میری افسانہ نگاری کی رفتار بہت سُست پڑ گئی ہے۔ اس سُست رفتاری کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے میری غُرُبِ درہی ہے، لفظ گرائیں بہاہور ہاہر ہے، چنانچہ قارئین میرے اس دور کے افلانے پڑھ کر محسوس کریں گے کہ میں الفاظ کی فضول خرچی سے ملن جتنا کم اجتناب کرتا ہوں اور میرے ان افسانوں میں شاید کوئی ایک لفظ بھی زاید یا فاتح نہیں ہے۔ یہ ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کر کے لکھنا بہت وقت طلب کام ہے۔

«کپاس کا پھول» کی اشاعت کے بعد میں نے گل سات افسانے لکھے ہیں جو «نیلا پتھر» میں شامل ہیں۔ آخر میں دو ایسے افسانوں کو بھی شامل کر دیا ہے جو «سنٹا»، «بازار حیات»، «برگ حناء»، «گھر سے گھر تک» اور «کپاس کا پھول»، مرتب کرتے ہوئے میرے ذہن سے اُتر گئے، اور اگر ان میں سے کوئی یاد آیا، تو وہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب نہ نوں دستیاب ہو سکتے ہیں، تو نہیں «نیلا پتھر» میں شامل کر دیا ہوں۔ مگر کے اس مرحلے میں سوچنے لگا ہوں کہ جو کچھ محفوظ ہو سکتا ہے اسے محفوظ ہو جانا چاہیتے۔

احسان

دھوپ نشہ آور بختی، مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

اس وقت آسمان اتنا نیلا ہوا تھا جیسے اسے چھولو، تو پوری نیلی پڑ جائیں۔ سورج مشرق میں پینتالیس کے زاویتے پر تھا۔ رات کی بارش میں اینٹوں کی چھت دھل گئی بختی اور دھوپ نے اینٹوں کو صیقل سا کر دیا تھا۔ اتنی کھلی چھت پر ہیں ایک کرسی اور ایک تپائی رکھ کر اخبار پڑھنے لگا تو وہ مجھے اپنی اپنی ساریگا۔ سو میں نیچے جا کر ایک رسالہ اٹھا لایا اور تب دھوپ کو مژارت سو بھی اور میں غنودہ سا ہونے لگا۔ میں نے انکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پوٹے نوکی طرح لال نظر آتے۔ میں نے سوچا کتنی عجیب ہات ہے کہ ہم بند انکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں جیسے اس وقت میں اپنے پوٹے دیکھ رہا ہوں۔ کوشش کی جلتے تو بند پوٹوں سے شاید اور بھی بہت کچھ دیکھا جاسکتا ہو۔

میں نے غنودگی سے جگ کرنے کی ٹھانی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے ناشہ کیا تھا۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ یہ علم الابدان کا کوئی راز ہو گا کہ جب سرماکی دھوپ میں انسان اپنی نظری کتاب پر یا کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ نیند سے پہنچنے کے لئے میں رسالے کی ایک غزل لگانے لگا، مگر میری لگنا ہٹ بہت مدھم تھی۔ ممکن ہے پڑوس کی چھت پر خواتین میری طرح بیٹھی دھوپ سینک رہی ہوں۔ میری اور پڑوس کی چھت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ انسان کے اوسط قدم سے بھی باقاعدہ بھر

اوپنی تھی۔ پھر جہاں پردے کے سلسلے میں اتنی اختیاط برتنی لگتی ہو، وہاں بلند آواز سے
گلگنا نام حیوب ہی ٹھہرے گا۔

دھب دھپ کی آواز سے میں چوڑکا پلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر نیچے صحن میں
جہاں کا میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں پلٹا تو دھب دھپ کی ایک اور آواز آئی۔ اب میں
نے اس کی سمت معین کر لی تھی۔ یہ آواز چھتوں کی حد فاصل کی دوسری جانب سے آ رہی تھی
میں سمجھا پتھے کھیل رہے ہیں سوداپس آ کر کر سی پر بلیٹھ گیا۔

ایک بار پھر دھب دھپ ہوئی اور پھر ایک نسوی آواز آئی۔ سینتے؟“

میں اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”بھی۔ آپ مجھ سے تو مخاطب نہیں ہیں؟“

”آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ آواز آئی۔“ مجھے معلوم ہے آپ اس مکان میں دوچار
روز پہلے ہی تشریف لاتے ہیں اور آپ سے کوئی جان پہچان بھی نہیں، مگر سوچا آپ کو تکلیف
دے کر دیکھتی ہوں۔ آپ کا کوئی ملازم ہے گھر کے کام کا ج کے لئے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہوٹل سے کھانا کھا لیتا ہوں۔“

”اس وقت آپ کے پاس کوئی دوست نہیں ہوں تو ان سے کہہ دیجئے۔“

”جی نہیں۔“ میں نے بتایا۔ اکیلا ہوں، مگر آپ کیسے تو کوئی کام ہے کیا؟“

”جی ہاں۔ آواز آئی۔“ میرے ابا جی پر فائح کا حملہ ہوا ہے اور گھر میں صرف میں ہوں۔

دن کا وقت ہے اور میں پر دہ کرتی ہوں۔ ایک دو لاٹی ہے دوکان سے۔ نسخہ میرے

پاس ہے۔ کیا آپ تکلیف کر سکیں گے؟“

”دنخوشی۔“ میں نے کہا۔ ”میں ادھر گلی میں آپ کے دروازے پر آتا ہوں۔ نسخہ

دے دیجئے تو ایک منٹ میں دوالاتا ہوں۔ دواویں کی دوکان تو چند قدم پر ہے۔“

”مگر کے موڑ پر۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔“

میں فوراً نیچے گلی میں آیا اور پڑوس کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر پردے کے لئے ایک پُرانا پنگ پوش آویزان تھا۔ اپنی موجودگی کا بتانے کے لئے میں کھنکار اتوں بی دبی آواز آئی۔ ”اچھا آپ تشریف لے آتے ہیں یہ لمحتے“

ایک ہاتھ لٹکی ہوئی چادر کے ایک طرف سے نکلا۔ سافولا۔ سافولا اور نازہ نازہ سا جیسے ابھی دھل کر نکلا ہے۔ ہاتھ چاہے میلا ہو چاہے صاف، سافولا ہو چاہے سفید، انسان کی عمر بتاویتا ہے۔ لوگ عمروں کے اندازے کے لئے خواہ مخواہ چہروں کو گھوستے رہ جاتے ہیں۔ لہذا انسانی عمر کا سچا غماز ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کی سی صحت کے ساتھ انسانی عمر کا اعلان کرتا ہے۔ اس سافولے اور نازہ ہاتھ والی کی عمر بیس بائیس برس کے آس پاس ہو گی۔ میں نے اس ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کی پوروں کے درمیان تھا ہوا نسخہ اور ایک روپے کا ذلت لے لیا اور کہا۔ ”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

”بھی شکریہ، آواز کو شوری طور پر دیا کر سرگوشی بنادیا گیا تھا۔“

عام سی دو احتقی۔ میں دو گولیاں لے کر فوراً پلٹا اور ایک بار پھر دروازے پر کھنکا را۔ ”ارے! اتنی جلدی!“ ہاتھ چادر کے ایک طرف سے باہر آیا۔ عہدآپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بڑا احسان کیا ہے؟“

”احسان!“ میں نے چیرت سے کہا اور گولیاں نسخے سمیت متحصلی پر کھدیں۔ ”احسان کا وزن تو بہت بھاری ہوتا ہے بی بی۔ ان دو گولیوں کا وزن تو احسان کے وزن کے پاس گنگ بھی نہیں۔“

”بھی میں گولیوں کے وزن کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ آواز آئی۔ ”ایک احنبی کے لئے چھت سے اترنے، یہاں آنے اور دوالانے کا اپنا ایک وزن ہے۔ آپ نے احسان کیا ہے اس لئے وزن کو محکوس نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے احسان لیا ہے اس لئے میری گردن احسان کے بارے ہجکی ہوئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔“

پھر مجھے اس کے جانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے گھر کی چھت پر آگر رسالہ کھول لیا، مگر وہاں سب لوگ حیات و کائنات کے مسائل سمجھنے میں لگتے ہوتے تھے۔ میری دشکیری کون کرتا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پوٹوں کی لمبائیوں سرخی کے پار دیکھنے لگا جہاں سے ایک ہاتھ اچکلی میں کاغذ کا ایک پر زہ لتے، ابھرا اور پھر جیسے لمبائیوں کو سرخی میں تخلیل ہو گیا۔ ایک بار ابھرا، پھر تخلیل ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چھوٹی بات! میں نے سوچا۔ مجھے لڑکی کا ہاتھ تظر آ رہا ہے مگر اس کا فائع زدہ باپ کھاتی نہیں دے رہا ہے جس کے لیے دوالا نے والاہی کوئی نہیں۔

میں رسالے کو بغل میں مار کر نیچے گھرے میں آگیا۔ ہر شے مٹھڑی ہوئی تھی گر خود میں کتنا پہ رہا تھا۔ ہم مشرقی لوگ بھی عجیب ہونق لوگ ہیں۔ اپنے لئے اتنے نلک بوس اخلاقی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور پھر تاک میں بیٹھ جاتے ہیں کہ قلعے کی دیوار پھٹے تو باہر کے منظر کی کوئی جدک نظر آتے۔ ہم خود ہی اپنی آنکھوں کو اندازھا کر کے عمر بھرا پانے اندھے پن کا علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

شام کو میں گھر سے نکلا تو چار قدم پر ہی پڑوں کا دروازہ تھا جس پر ایک پُرانا پنگ پوش نلک رہا تھا سوچا، لڑکی کے آبا کی مزاج پرسی کر لینی چاہیتے۔ پڑوں کے تو ایک دوسرے پر بہت حقوق ہوتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دٹھے ای

”کون!“ دور سے لڑکی کی آواز آئی۔

”جی میں۔ آپ کا پڑوں سی؟“ میں نے کہا۔ ”اب آپ کے آبا جی کے مزاج کیسے ہیں؟“ ”اچھا تو آپ ہیں!“ اس کی آواز میں اطمینان تھا۔ ”میں اور پر چھت کی دیوار پر بہت دیر تک دھپ دھپ کرتی رہی۔ پھر سوچا آپ کیسی چلے گئے ہیں؟“

”جی میں تو نیچے گھرے میں تھا“ میں نے کہا۔ ”آپ میرا دروازہ کھٹکھٹا دیتیں؟“ ”وہ بولی۔“ اس کے لئے مجھے دن کو گلی میں جانا پڑتا اور میں عرض کر چکی ہوں کہ میں

پر دہ کرتی ہوں۔“

”جی،“ میں مسلکے کی نزاکت کو سمجھ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ اب یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ آپ گی میں ہیرے دردرازے پر کھڑے ہیں اور میں پردے کے پچھے سے آپ سے باقیں کر رہی ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ پر سے کوئا بنانے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں؟“

یکایک مجھے اکٹھا بہت سا احساس جنم ہوا۔ میں نے ایک قدم ہٹ کر کہا: ”آپ ٹھیک کھتی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔ میں تو صرف مزاد پرسی۔“

”مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آپ کو کیوں بلا رہی تھی؟“ اس نے لکھتے تھے پتنگ پوش کا ایک کنارا بانڈھ میں لے لیا۔ کپیوٹر چلنے لگا۔

”جی، جی،“ میں نے کہا۔ ”فرمایتے ہیں میرے لائق کوئی خدمت؟“

”ڈاکٹر کو بلانا ہے،“ اس نے کہا۔ ابا جی کی حالت دیسی ہی ہے اور پہاڑ جیسی رات آنے والی ہے۔ میں کل شام کے اندر ہیرے میں بر قعہ اور ہر کر ڈاکٹر عبد القados کو بلا لائی تھی۔ انہی کو پھر بلانا ہے۔ قریب ہی ہیں۔ آپ کو تخلیف ہو گئی مگر کیا کروں۔ ابا جی کو تنہا چھوڑتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آجائیں گے۔ ابا جی سے ان کی جان پہچان ہے۔“

”ابھی لاتا ہوں،“ میں نے کہا۔ ”میں نے ان کے گلینک کا بورڈ دیکھا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب ایک معسرہ اور سخیف و نزار بزرگ تھے۔ وہ فُسخہ لکھ رہے تھے اور ایک تنومند مریض ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مریض دراصل ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر صاحب دراصل مریض ہیں۔ میں نے جا کر عرض کیا تو فوراً نسخہ مریض کے حوالے کیا، سیٹھکوپ اٹھا کر میرے ساتھ چل پڑے۔

میں نے جا کر دستک دی اور ساتھی کہا: ”ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے

پس ۔“

”جی اچھا ۔“ دُور سے آواز آئی۔ پھر پنگ پوش پورے کا پورا اٹھ گیا۔ لڑکی پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں سمجھا اس نے بدحواسی میں پردہ اٹھا دیا تھا، چنانچہ میں گھبرا کر پتھکھے ہٹا تو وہ بولی مکونی بات نہیں۔ آپ بھی آ جائیتے۔ میں نے آبا جی کو بتا دیا ہے۔“ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھی۔ آبا جی سُن بھی رہے ہیں، دیکھو بھی رہے ہیں۔ بس بول نہیں سکتے۔“ اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے دل نے گواہی دی کہ کپیوٹر کا اعلان حرف بہ حرف، نقطہ بن نقطہ درست تھا۔

یہ گھر بالکل میرے گھر کے مشابہ تھا۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ وداصل پلے کمرے کا دروازہ تھا۔ دوسرا کمرہ ملحت تھا۔ بغل میں باورچی خانہ اور کائنات ختم۔ اگر حیوانات اشراف المخلومات ہوتے اور انسانوں کو پالتو جانوروں کی طرح رکھتے تو ان کے لئے ایسے ہی ڈربے بناتے۔

ڈاکٹر صاحب اور لڑکی تو دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک ہی دن میں ایک جوان پردہ نشین کا یوں بے تبلیغی سے سامنے آ جانا ضرور تا بھی ہو سکتا ہے اور مجبوراً بھی۔ ضرور تا یوں کہ باپ کی بیماری میں کام آنے والا کوئی تو ہونا چاہیئے اور مجبوراً یوں کہ۔۔۔ آخر سمجھی کے سینے میں دل ہوتا ہے اور باپ بیمار بھی پڑا ہو تو دل کے احکام ٹالے نہیں جاسکتے۔

”آپ تو باہر کھڑے رہ گئے۔“ لڑکی دوسرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوتی۔۔۔ اپنوں سے کیا پردہ۔۔۔ آ جائیئے نا!“

ایک کونڈے کی طرح یہ فیصلہ میرے دل و دماغ میں کپک گیا کہ معاملہ ضرورت کا نہیں ہے، مجبوری کا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ایک لمبے میں میرا قد ایک آدھ انج

ضرور بڑھ گیا ہو گا۔

لڑکی کے آبا جی خاصے و جیہے، مگر بے حد کمزور بزرگ تھے۔ چھوٹی سی آہی سفید آہی سیاہ ڈار ہی تھی۔ مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں نے ان کے ہونٹوں کے فرائض انجام دیتے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ مسکراہٹ نظر آگئی۔ بولے۔ ”صیبحہ بیٹی۔ قریشی صاحب اس فوجوان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔“ میں سمجھا صیبحہ جھینپے گی گروہ بظاہر ذرا سی بھی تو نہیں جھینپی۔ صرف اتنا بولی۔ ”میں آبا جی کو بتاچکی ہوں کہ ہمارے یہ پڑوسی صاحب بڑا درد مند دل رکھتے ہیں۔“

اب تو میں صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پرداہ اٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ میں قریشی صاحب کی دوا کے علاوہ ان کے گھر کا سودا بھی لانے لگا۔ ایک دن صیبحوں مجھ سے بال پنیں تک منگوایں، البتہ بات چیت تخلیف معاف اور ”آپ نے بڑا حان کیا ہے“ سے آگئے نہ بڑھی۔ صیبحہ مجھے دیکھتے ہی بہت فراغدی سے مسکراتی تھی اور مجھے بہت گھر انسیاتی تجویز کرتا تھا۔ سودے کے لئے رقم دیتے ہوتے اس کی پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھوگئی تھیں۔ پرسوں شام کو وہ میرے سامنے دو پٹے کے بغیر لوں ہی تو نہیں آگئی تھی۔ مجھے جو اس نے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں ہُر ل جاتی، تو اتنی بھعنی بات اس نے یوں ہی تو نہیں کہہ ڈالی تھی۔ نہیں، میں اُسے رُلنے نہیں دُوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں ہُر لئے کے لائق نہیں ہوتیں۔

ایک رات میں نے طے کیا کہ اب اظہار میں تاجر نہیں کرنی چاہیتے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ دیجئے کہ مجھیں جات کی کمی ہے، چنانچہ صبح کو سودا لا کر دینے کے بعد میں گھر آیا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اظہار کی مشق کرتا رہا۔ پھر باہر گلی میں جانے کے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس دفعے میں پہلی بار محسوس ہوا کہ صیبحہ کے درد ازے پر

دستک دینے کے لئے شیر کا کلیجہ چاہیئے۔

اور ابھی میں اپنے مر جھاتے ہوئے حوصلے کوتازہ دم کرنے کے مرحلے میں تھا کہ وہ میرے سامنے آگئی۔ اولیس صاحب! ذرا جلدی سے آجائیے، پھر فوراً ہی وہ مشین کی طرح پلت گئی۔

میں باہر لپکا۔ پردہ اٹھا کر اندر گیا تو وہ دوسرے کمرے میں تھی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا تو وہ اپنے آباجی پر جھکی پچھے سے انسیں پانی پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی: "آباجی خوش ہو گئے تھے۔ میں نے گھبرا کر آپ کو بلا لیا۔ اب ٹھیک ہیں۔" پھر قریشی صاحب پر جھک کر پوچھا: "آباجی، اب آپ ٹھیک ہیں نا؟"

قریشی صاحب کے تیور اگرچہ منجد تھے۔ مگر ان کے چہرے کے کسی نہ کسی حصے سے اس جانب کا تاثر مل رہا تھا کہ — ٹھیک ہوں یہی۔

بڑی اختیاط سے گردن تک لحاف اور رہا کر دہ بولی۔ "چاٹے پہیں گئے نا آباجی،" پھر جیسے اس نے جواب سُن لیا ہو۔ بسور کر بولی۔ "میں رو نے بیٹھ جاؤں گی میں آپ کے سینے سے لگ کر۔ یہ اولیس صاحب بھی مجھے چپ نہیں کر سکیں گے۔ ہاں — لاؤں چاٹے ہے،" پھر دہ خوش ہو کر سیدھی ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔ "آباجی راضی ہو گئے ہیں،" کمرے سے باہر نکلی تو میں بھی ساختہ ہی چلا آیا۔ مجھے ایک موٹھے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ "چاٹے میں بناؤں گا،" میں نے کہا۔

وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔ پھر مسکراتی اور بولی۔ "آئیے۔ مل کر بنائے لیتے ہیں۔" میرے باورچی خانے کا سا با اورچی خانہ تھا، چنانچہ ایک بار تو میں سمجھا وہ میرے گھر میں ہے اور میرے لئے چاٹے بناء ہی ہے۔ انہمار کے لئے یہ مناسب ترین وقت تھا — مگر کیا یہ مناسب ترین وقت تھا؟

کیتنی کوچولھے پر کھکر دہ بولی۔ "آج آپ اتنے چُپ کیوں ہیں اولیس صاحب؟"

”چپ؟“ میں نے پوچھا۔ ”کون؟“ میں، ”مگر میں ایسا باتوں کب تھا صیحہ صاحبہ؟“ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ اگر میں ”صیحہ“ کے ساتھ ”صاحبہ“ کا لاحقہ نہ لگاتا تو آدھا اندر تو یوں ہی ہو جانا۔

”میں نے کب کہا کہ آپ باتوں ہیں؟“ صیحہ پیالیاں دھوتے ہوئے بولی ”اب آپ مجھے کھوئے کھوئے سے لگے اس لئے پوچھ لیا اور اس لئے بھی پوچھ لیا کہ کھویا کھویا تو مجھے لگنا چاہتے ہیں؟“

یہ بھی اندر کا ایک پلٹ ہے، میں نے سوچا۔ اب لوہا گرم تھا۔ میں نے ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ ”بات یہ ہے صیحہ۔“ ”صاحبہ“ کنے سے پہلے میں نے حلقوں میں انکا ہوا کا گولا نگلنا چاہا، کہ اوہر سے قریشی صاحب کی بہت لمبی کھانسی کی آواز آئی اور صیحہ گولی کی طرح باورچی خانے سے نکل گئی۔ میں نے اس دوران میں چائے تیار کر لی۔ درود حنفی کی طرح بار بار چائے کی طشت میں سب چیزیں سجا میں تودہ واپس آئی۔ ”ارے!“ وہ مسکرا کر بولی ”آپ تو رذکیوں کی طرح سلیقہ مند ہیں!“

رذکیوں کی طرح اے۔ میں نے ناگواری سے سوچا۔ پھر کہا ”سلیقہ مندی پر صرف رذکیوں کا اجراہ تو نہیں صیحہ صاحبہ۔“ ناگواری کی وجہ سے میں صاحبہ کے لفظ کو ردک نہ سکا۔

”میں نے آپ کی صنف پر تو حمد نہیں کیا اوس صاحب“ وہ بولی ”ویسے یہ تو آپ مانیں گے کہ سلیقہ مندی میں فوکیت لڑکی ہی کو حاصل ہے، پھر طشت اٹھا کر بولی ”آئیے۔ آپ اوہر کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں آباجی کو چائے پا کر حاضر ہوتی ہوں۔ آئیتے؟“

میں اس کے پیچے اسی کمرے میں آیا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور جس پر پرانا پنگ پوش لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک موڑھے پر بٹھا کر اس نے چار پانی پر ٹپی

ہوتی ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ جب تک آپ یہ کتاب دیکھتے ہیں۔
یہ ٹانسٹائی کی "اینا کرہینا" تھی۔ میں نے اسے پڑھ کھاتھا اس لئے پرلی طرف
ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر ٹوٹی ہوئی کتابوں کے پاس گیا۔ سب سے اوپر ایڈر اپاؤنڈ کی
نظموں کا مجھ میں خدا کھاتھا۔ اس کے نیچے پاسترنک کی روشنی نظموں کے انگریزی ترجمہ کی تباہ
تھی۔ پھر بیدی کا طویل افسانہ "اک چاد رسیلی سی" — نہ کوئی ڈا جسٹ، نہ کوئی نیزو ویک
نہ کوئی اسٹریڈ ویکلی! خاصی بقراط لڑکی معلوم ہوتی ہے!

"آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے؛ وہ اسی موڑھے پر اگر بیٹھ
گئی جس پر مجھے بٹھا گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔" میرے خیال میں آپ موڑھے
پر بیٹھیں۔ میں چارپائی پر بیٹھتی ہوں؛ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور
دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ "میں چاۓ تو وہیں چھوڑ آئی!"

جب تک وہ طشت لے کر واپس آئی، میں موڑھے پر بیٹھ کھاتھا۔ بیٹھنے کے باوجود
مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑا ہوں۔ آج اسے مجھ سے ایک ضروری بات کہنی ہے نا۔
اور میں جانتا ہوں اس عمر میں ضروری بات کیا ہوتی ہے گر کیا یہ ضروری بات کہنے میں پل
مجھے نہیں کرنی چاہتی۔ — بہر حال دیکھتے ہیں — دیکھتے ہیں۔

اس نے چاۓ بنائی پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بالکل میرے سامنے چارپائی پر
بیٹھ گئی۔ "اویس صاحب" وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی لکپچی تھی جو جھپپاتی جا رہی تھی
مگر جیچنے میں بھی تھی۔ "اویس صاحب" میں نے آج ابھی ابھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے؟"
مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر کھا ہے، میں نے سوچا۔

"اویس صاحب" وہ چارپائی کو ذرا سا گھسید کر میرے اور قریب آگئی۔ "میں
دنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔"
یہ جملہ کہہ کر صبیحہ مجھ پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے یہ پرانا مفرود نہ غلط ثابت کر

دیا تھا کہ عورت چاہے ہزار جان سے مرد پر فریفته ہو، محبت کا اظہار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔

”اویس صاحب“ اب اس کی آنکھیں ڈپ بارہی تھیں ”میں دو بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں مگر میرے یہ دونوں بھائی روپے کی تلاش میں اوہ را بُطھی اور دو تھی کی طرف نکل گئے اور دولت کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ اس گھر سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل بھاگے۔ امتی کا انتقال ہوا اور اباجی نے انہیں اس حادثے کا تابع بھجوایا تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جوابی تاریخاً جو صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ — ”سوروی“ — ”سوروی“ آپ جانتے ہیں کہ ”افسوس ہے“ کی انگریزی ہے۔ اباجی ہر روز اٹھ کر اور ہر روز سونے سے پہلے بھڑک سے پوچھتے تھے کہ صابی، تمہارے ان بھائیوں کو کس پر افسوس ہے؟ اپنی ماں کی موت پر افسوس ہے یاد کہنا چاہتے ہیں کہ افسوس ہم اتنے بڑے حادثے پر بھی اپنی دولت کی مشینیں روکنے سے اور پاکستان آنے سے قاصر ہیں۔ میرے یہ دونوں بھائی بھجو سے بڑے ہیں۔ شروع شروع میں خط لکھتے رہے۔ بھرو ہیں شادیاں کریں اور خط بند کر دیتے۔ اب کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دعا بھجوادیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے مجھے انہوں نے ایک تسبیح بھیجی تھی جس سے بہتر تسبیح میں یہیں اپنے شرکے بازار سے دور دپے میں خرید کی ہوں۔ سو اویس صاحب، میں ان بھائیوں کی بہن ہوں اور یاد رکھنے یہ میرے لگے بھائی ہیں مگر دولت تو سگوں کو بھی سوتیلا بنادیتی ہے۔“

صیہد نے دوپٹے کے پتو سے آنکھیں پوچھیں اور بولی۔ ”معاف کیجئے گا۔ میں رو نے والی رُکی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی آنسو زبردستی اپنے بہنے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اسے رُنگیوں آرہا ہے اور جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچے آنسو اپنا کام کر کچے ہوتے ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے؟“

”جی نہیں“ میں نے کہا۔ ”اللہ پر شیان ہو گیا ہوں۔“

”میں بات کو محض کرتی ہوں،“ وہ بولی۔ ”یہ باتیں جو میں آپ سے کر رہی ہوں مجھے اپنی امتی سے کرنی چاہیئے تھیں مگر وہ ہیں نہیں۔ ابا سے کرنی چاہیئے تھیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بھائیوں کا احوال آپ نے سُن لیا۔ اسی لئے تو میں نے ایک پڑوسی فوجان کو اپنی سہیلی کہا ہے کہ میں اس بھری دُنیا میں آپ کے سوا کسی سے یہ بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا بھرم رکھیں گے اور مجھے شرمندہ نہیں کریں گے؟“

”آپ کسی باتیں کر رہی ہیں صبیحہ صاحبہ؟“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میں اور آپ کا بھرم نہیں رکھوں گا! میں اور آپ کو شرمندہ کر دوں گا!“ — میں جو آپ کے —
جو آپ کے ایک —“ پھر میں نے سوچا کہ اس صورتِ حال میں میری طرف سے اظہار مناسب نہیں ہو گا۔ پھر ہی۔ شام کو ہی۔

”میرے آبا بہت غریب آدمی تھے،“ صبیحہ بولی۔ ”نخنی سے نیاری کی دوکان کرتے تھے۔ یہی سوتی، دھاگہ، بٹن، لکھنی، بال پنیں وغیرہ بیخعتے تھے۔ ان کا ایک کھوکھا تھا۔ شام کو گھر آتے تھے تو اپنا سارا اٹاثہ گھٹھری میں باندھ کر لے آتے تھے مگر آفرین ہے ان کی استقامت پر اور اتنی کی ہمت پر کہ پیسہ پیسہ جمع کرتے رہے اور ہم تینوں کو پڑھاتے رہے۔ بھائیوں میں سے ایک نے ایف اے کیا اور ایک نے میٹر ک اور پھر چڑیا کے پتوں کے پرنکل آتے اور وہ دوسرے نگروں کو چل دیتے۔ اس وقت میں آٹھویں میں نہیں۔ اب سارا لاد پیارا سارا پیسہ مجھ پر خرچ ہونے لگا مگر میں بجھٹی نہیں۔ میں نے میٹر ک کیا، پھر ایف اے کیا، انہی ونوں امتی چل بیس۔ اس کے بعد میں نے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے میں داخلہ بھی لے لیا مگر پھر اباجی پر فانج کے جھٹے ہونے لگے۔ دو چار دن ان کا ایک بازو اور ایک نانگ سُن رہتے مگر پھر چلنے پھرنے لگتے، تب میں کانج چلی جاتی مگر ایک آدھ دن کے بعد ان پر پھر حملہ ہو جاتا۔ آدمی زک گئی۔ میرا کانج جانا بند ہو گیا اور اب کے تو اب اکی زبان

ہی بند ہو گئی ہے۔ آج داکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اب ان کا صحت یا بہونا مشکل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے منہ میں خاک، آج کل پرسوں تک چل بسیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ دو تین چار سال تک زندہ رہیں مگر وہ اسی حالت میں زندہ رہیں گے۔ — معلوم حالت ہیں۔“

صبعیحہ نے شعوری طور پر آنسو پیسے اور پھر گلا صاف کر کے بولی۔ ”یہ سب پس منظر تھا اس بات کا، جو مجھے آپ سے کہنی ہے۔ اگر میں براہ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے جیسا سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ابھی محلے میں یہ بات زیادہ نہیں پھیلی ہے کہ کھو کھے میں فیکاری کی دکان کرنے والا قریشی معلوم ہو چکا ہے جس روز سارے محلے کو یہ بات معلوم ہو گی، میں ایک ایسی لڑکی بن کر رہ جاؤں گی جو رات کے اندر میرے میں مرٹک پر سے گزرتے ہوتے، غنڈوں کے زخمی میں آجائی ہے۔ میرے گھر میں پھر دوں پر لپٹے ہوئے مجنت نہ میں گرنے لگیں گے۔ میرے گھر کے دروازے پر لوگ، مجھ پر آوازے کیں گے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اس گھر میں زندہ موجود ہے مگر میں اس گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں اور ہمارا معاشرہ جو اپنے آپ کو ہرامقدس کہتا ہے، اکیلی عبے آسرالرُّکی پر یوں بھپٹتا ہے جیسے کہ ہر دار پر بھپٹتے ہیں۔ سو میں نے فیصلہ کیا ہے اولیں صاحب، کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیئے۔“

”درست فیصلہ ہے۔ بالکل درست فیصلہ۔“ میں نے صبعیحہ کی بھرپور تائید کی اور تائید کرتے ہوئے میری آواز اتنی بدلت گئی کہ خود میں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ ”خدا آپ کا بھلا کرے،“ صبعیحہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ”مجھے غلط مت سمجھیئے گا۔ مجھے ایک نگران ہاتھ چاہیئے۔ میں دوٹ کامال نہیں بننا چاہتی۔ میرے بھائی مجھے اگر اس درندہ معاشرے کے آگے ڈال گئے ہیں، تو اس کا یہ طلب نہیں کہ میں اس درندے کا شکار ہو جاؤں۔ میں اس درندے کے پھیلے ہوئے نوکیلے پنجوں کی زد سے باہر بھی تو جا

سکتی ہوں۔ میں شادی بھی تو کر سکتی ہوں۔“

”یقیناً۔ یقیناً۔“ میں نے تائید مزید کی۔

”مجھے بس اتنی بات آپ سے کہنی تھی کہ کوئی اچھا سارشہ نظر میں رکھتے۔ اچھا سے میرا مطلب شریف آدمی سے ہے جو محبت کر سکتا ہو۔ قربانی دے سکتا ہو۔ لالچی نہ ہو، تنگ ظرف نہ ہو۔ دنیا کی خوبصورتیوں سے پیار کر سکتا ہو، دنیا کی بد صورتیوں سے نفرت کر سکتا ہو اور اس نفرت کا اظہار کر سکتا ہو۔ مجھے کوئی دولت مند انسان نہیں چاہئیے، اصرت انسان چاہئیے جو غیر معمولی نہ ہو۔ عام سما ہو، جیسے میں ہوں۔— جیسے آپ ہیں۔“

اب اظہار کمل ہو گیا تھا۔ اب مجھے مزید تفصیل پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں بونڈھ پڑھا ہوا کمرے میں تیرتا پھرتا تھا۔ ایک بار جی چاہا بڑھ کر صبیحہ کو سینے سے لگاؤں اور اسے ہتاوں کہ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی اور کسی نے سچ کہا تھا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل میں نے طے کریا تھا کہ شام تک اسے یہ بتانے آؤں گا کہ میں نے تمہارے لئے رشتہ دھونڈ لیا ہے۔ لڑکا تمہارے معیاروں کے عین مطابق ہے اور لڑکے کا نام اولیس ہے اور وہ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔

ویسے مجھے صبیحہ کی ذہانت پر حیرت ہو رہی تھی کہ اظہار محبت کا یہ بالواسطہ طریقہ آج تک اور کسے سُوجھا ہو گا۔

”ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شام تک آپ کو بتاسکوں گا۔“

”صبیحہ کھل اٹھی۔“ یہ بڑا احسان ہو گا آپ کا۔“

”احسان کا ہے کا صبیحہ۔“ میں صبیحہ سے تعارف کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے ”صاحبہ“ کا لاحقہ گول کر گیا تھا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ اب

تو معاملہ صاف تھا۔

میں لکھے ہوئے پنگ پوش تہک پہنچا تو وہ بولی ”اویس صاحب۔ سینئر“ میں رُک گیا۔ ”کیتے؟“

وہ میرے بہت قریب آگئی اور بولی ”عمر کا خاص خیال رکھتے گا۔ سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لئے زندگی کا تجربہ بہت فروختی ہے۔ میں اکیس بائیس برس کی ہوں۔ اسے کم از کم اکنیس بیس برس کا ضرور ہونا چاہیتے۔ میری آپ کی عمر کے رُک کے عام طور پر بہت انتہلے ہوتے ہیں۔ ناجربہ کار، نمائشی سے، اونڈے سے، سمجھ گئے نا آپ؟“

میں نے دیوار کا سمارائے کر اسکھیں بند کر لیں۔ پھر سُورج جیسے چھت کو توڑ کر میرے سر پر اتر آیا۔ سارا منظر ہو ہو رہا تھا اور وہ اس ہو کے سیلا ب کو عبور کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔

۱۹۶۹ء

عورت صاحبہ

جب دوسروں کو نہ ہوتا تھا تو کسی پر دنیا کی بے ثباتی کی وجہ سے وقت طاری ہو جاتی، کوئی حاضر اور غائب لوگوں پر گالیوں کا طومار باندھ دیتا، کوئی استغراق میں چلا جاتا اور کوئی قریب بیٹھے ہوئے مردیا عورت کے کندھے پر سر کھو سو جاتا، مگر امتیاز کے آٹھ ہونے کا اعلان اس وقت ہوتا تھا جب وہ اٹھتا اور لڑکھڑا آہوایوں پلنے لگتا کہ اس کے پاؤں کا رُخ کسی طرف ہوتا اور چہرے کا رُخ کسی طرف۔ یوں وہ میزدہن پہنچیوں کو والٹتا، یوں تلیں اور گلاس توڑتا کہیں سے کہیں جاگرتا۔

لب کے نمبر کہتے تھے کہ امتیاز نہایت نہذب اور لکھڑ جوان ہے۔ بھپر وہ کاروبار میں مہارت کے معلمے میں اپنے والد سیٹھ نواز احمدجی سے بھی دوستخدا آگے ہے۔ اسے سب کچھ آتا ہے، صرف گز نہیں آتا اور وہ تھیک کہتے تھے۔ امتیاز یوں گرتا ہے آسمان گرا ہو۔ وہ بیان سے وہاں تک گرتا چلا جاتا اور ساتھ ساتھ پکارتا جاتا۔ — «عورت! اے عورت! اے عورت صاحبہ!»

تب دیڑ پاہر جا کر سیٹھ صاحب کے درائیور کو بلا لاتا اور امتیاز کو کار میں ڈال کر گھر پہنچا دیا جاتا۔

حرب امتیاز یورپ سے واپس آیا تھا تو لب میں آٹھ ہونے کے بعد اس نے

پورے کلب میں کھلبی ڈال دی تھی۔ جس پہلی عورت پر اس کی نظر پڑی تھی وہ کلب کے ایک سینٹر نمبر اجدا صاحب کی بیوی تھی زدہ جسے ایک طلس میں آگرا اس پر جھپٹا تھا اور اس ہنگامے میں کلب کی بہت سی کارکری ٹوٹ گئی تھی۔

دوسرے روز کلب کے سینٹر نمبر سینٹھ صاحب کے پیلس میں حاضر ہوئے تو انہی بہت سی کاروں میں اتنے بحوم کو دیکھ کر سینٹھ صاحب کی بیگم اور بیٹی حیرت زدہ ہو کر برآمدے میں آگئی تھیں مگر اجدا صاحب کے سمجھانے پر کہ یہ سینٹھ صاحب کا اور ہمارا پرانی بیویت معلمہ ہے، واپس چلی گئی تھیں۔

عام مکاؤں کے رتبے سے بھی ڈرے ڈرائیگر روم میں بیٹھ کر مہروں نے سینٹھ صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ امتیاز کی فور آشادی کر دیں کیونکہ وہ "عورت عورت" پکارتا پھرتا ہے۔

سینٹھ صاحب ہنسنے لگے۔ "اچھی بات ہے۔ عورت کی طلب بہت زیادہ ہو تو شادی کا میاب رہتی ہے۔ اس طلب کو ابھی ذرا سا بڑھنے دیجئے۔"

سب مہروں نے حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نمبر بولا:

"تو آپ نی الحال اپنے صاحبزادے کو سمجھا دیجئے۔"

سینٹھ صاحب ہنسنے لگے۔ پھر بولے: "سمجاوں؟ یعنی آپ سب ماشرا اللہ پئیے والے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں پہنچنے والے کو سمجھاؤں! بھتی نہ تو سمجھو جھکی بالوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی نفیات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سینٹھ صاحب" اجدا صاحب بولے "مگر تم سب ماوں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں والے ہیں اور ہماری نفیات کا ایک حصہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ یہ غیرت کی نفیات ہے۔ آٹھ ہو جانے کے بعد بھی ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کون تی

ہمارے دومن فوک پر دست درازی کرے!“

”دست درازی!“ سیٹھ صاحب سمجھیدہ ہو گئے۔ ”یہ تو بہت سخت لفظ ہے ماجد صاحب۔ امتیاز عورتوں سے آزادی کے ساتھ گپ لڑا سکتا ہے مگر دست درازی! یہ ناممکن ہے۔ آخر وہ میرا بیٹیا ہے۔ اس کی رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے تشریف خون!“ ماجد صاحب نے بھی اسی سمجھیدگی سے عرض کیا: ”سیٹھ صاحب، خون چاہے شریف ہو لیکن جب گرم ہو کر ابلنا ہے تو شرافت کے سارے جرأتم مر جاتے ہیں اور نیچے سے ایک حصی نکل آتا ہے — ڈریکولا!“

”اچھا تو آپ امتیاز کو حصی اور ڈریکولا کہہ رہے ہیں۔“ سیٹھ صاحب کو غصہ آگیا۔ ”جی نہیں سیٹھ صاحب۔“ ماجد صاحب بولے۔ ”ہم نے انہیں ڈریکولا بنشتے سے بُردقت روک لیا، ورنہ وہ میری بیوی کو چھیرنے پھاڑنے کے لئے اسی نیت سے جھپٹتے تھے۔ یہ سب دوست موجود تھے۔ ان سے پوچھ لیجئے۔“

سیٹھ صاحب نے سب پر ایک نظر دوڑا۔ پھر بولے ”کون سی بیوی تھیں آپ کی ہی پہلی یاد دوسرا ہی ہوں گی۔ بھر حال معلوم ہوتا ہے امتیاز یورپ اور امریکہ کے قیام میں مخلوق گیا ہے کہ وہ کس ملک کا رہنے والا ہے اور کس معاملہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ کلب جاتے ہی نہیں۔ گھر میں ہر قسم کی دہسکی موجود ہے۔ میں پی پلا لے!“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک نمبر بولا۔ ”یہ کلب آپ ہی کی سخاوت سے چل رہا ہے۔ آپ نے یہاں نمبروں کے لئے اتنی سہو تین جمع کر دی ہیں کہ سارا شہر اس کا نمبر فنا چاہتا ہے مگر وہ جو آپ نے کم میں ہزار روپے ماہنہ کی آمدی کی مشرط لگا دی تھی، تو اس کی وجہ سے کوڑا کرکٹ باہر رہ گیا ہے اور شہر کی کریم اس کلب میں جمع ہو گئی ہے۔ جس طرح غالب اپنے دیوان غالب کی وجہ سے کبھی نہیں مر سکتا، اسی طرح یہ کلب آپ

کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ امتیاز صاحب پر زیادہ پابندیاں نہ لگائیے ہماری رخوت یہ ہے کہ چند روز تک آپ بھی ان کے ساتھ آ جایا کیجئے۔ آپ کی وجہ سے وہ حدے نہیں ٹڑھیں گے اور پھر بھی ان کی عادت ہو جائے گی۔“

”بات معقول معلوم ہوتی ہے“ سیٹھ صاحب کے خدوخال نارمل ہونے لگے۔ ”آجاؤں گا“ پھر وہ ماجد صاحب سے مخاطب ہوتے ہیں اگر امتیاز میاں سے کوئی زیادتی ہو گئی ہے تو انشاء اللہ وہ آپ سے معافی مانگے گا۔ دراصل وہاں دیست میں تہذیب اور شرافت کا معیار —“

ماجد صاحب ابھی تک تنے بیٹھے تھے۔ سیٹھ صاحب کو لوگ دیا اور بولے: ”دیست کے معیار ہم سے مختلف ہی، مگر ابھی انہوں نے بھی اپنی ہیویوں بیٹیوں کو نیلام کا مال نہیں بنایا۔“

سیٹھ صاحب نے چونکر ماجد صاحب کی طرف دیکھا۔ ایک لمبے مسلسل دیکھتے رہے، پھر بولے: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امتیاز کو کلب جانا ہے تو مجھے بھی جانا پایا گی مگراؤں گا۔ کلب کو بدنام نہیں ہونا چاہیتے۔“

سب لوگ سلطمن ہو کر چلے گئے تو سیٹھ صاحب نے فون کر کے امتیاز کو اپنے مرکزی کاروباری دفتر سے بلا بیا اور اسے کلب کے سینئر ممبروں کے ساتھ گفتگو کا حال بتایا۔ پھر بولے: ”اس کلب سے ہم نے ٹرے ٹرے فائدے اٹھائے ہیں بیٹا، اگر اس وقت ہم ارب پتی ہیں تو یوں سمجھو کوہ اس ارب میں آدھا کنٹری ہوشن اس کلب کا ہے جس کے ماحول میں پختہ روم ہو جاتے ہیں اور لوہا اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ جدھر چاہو مودلو میں اسے اپنی مزار اور اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کپیکس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی لگڑوں اتنی زبردست ہے کہ اچھے اچھے اس کی رکنیت کے لئے ترستے ہیں۔ اے

بدنام نہیں ہونا چاہیتے۔ کل تم نے اچھا نہیں کیا؟
وکیا اچھا نہیں کیا ڈیڑ پی؟ امتیاز حیرت سے بولا ہے کیا ہوا تھا کل؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا
تھا۔ بس ذرا سی زیادہ پی لی تھی۔“

”تم نے ایک سینئر میرا ماجد کی بیوی سے زیادتی کرنا چاہی۔“ سیٹھ صاحب نے
اسے اطلاع دی۔

امتیاز کو کچھ یاد آیا۔ ”اچھا تو وہ ہے ڈیڑ۔ آپ نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ آپ نے کبھی
صندر میں گوندھا ہتو اجسم دیکھا ہے؟“

سیٹھ صاحب بڑے محظوظ ہوتے۔ ”یہ ماجد کی دوسری بیوی ہے، بلکہ قیسی سمجھو۔
ایک مر جھی کلی ہے۔ خوبصورت تو وہ مہالغت کی حد تک ہے مگر وہ ماجد کی بیوی ہے۔ تم کیا
کرنے پڑے تھے اس کے ساتھ؟“

”اس کے حسن پر مبارکباد دینے ڈیڑ، امتیاز بولا۔“ اسے بتانے کے قدرت سے
بھی ایسے ایسے شاہنکار کبھی سمجھا رہا تھا تخلیق ہوتے ہیں۔“

ہبادت تو تم نے ذہانت کی کی ہے،“ سیٹھ صاحب محظوظ ہوتے جا رہے تھے۔ ”مگر
یہ مشرق ہے امتیاز اور نیٹ، ایشیا اور ہمارا ایشیا جہاں اسلامی معاشرت پڑتی ہے۔ تم
ایکی سن میں اور ہمارا کسفورد میں پڑھے اور کاروباری تجربے کے لئے یورپ اور امریکہ کا
شہر شہر گھومے اور بھول گئے کہ تمہارا نام امتیاز احمد ہے تو کیوں ہے؟ اور میں سب سے چھپ کر
پڑتا ہوں تو کیوں پڑتا ہوں۔ تمہیں آئندہ زندگی بیاں بس کرنی ہے اور ہمارے کلب کو بدنام نہیں
ہونا چاہیتے۔ پس یہ مگر تین چار پیگ سے زیادہ نہیں۔ میرا تو اتنے ہی میں کام ہو جاتا ہے۔
اگر محسوس کرو کہ تو اذن بگزرا رہا ہے، تو اٹھ کر چلے آیا کرو۔ کل سے میں تمہارے ساتھ چلوں
گا۔ تم پہلا کام پیدا کر دے گے کہ ماجد سے معافی مانگو گے۔“

امتیاز نے پوچھا۔ ”مگر ڈیڑ میں یہ معافی مسز سے انگ دوں تو کیسار ہے؟“

اس بات پر باپ بیٹا دیتک ہفتے رہے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے رہے۔

دوسرے روز سیدھو صاحب بھی امتیاز کے ساتھ کلب پہنچے تو سب کے چہرے مکمل اُٹھے۔ سیدھو صاحب میٹے کوئے کر ماجد صاحب کی میز پر گئے اور امتیاز کو اشارہ کیا، تو اس نے بڑی تیزی سے معافی مانگ لی مگر ساتھ ہی کہا: "مسنون ماجد کماں ہیں۔ میں ان سے بھی معافی مانگ لوں؟"

ماجد صاحب بولے: "کل کے واقعے سے ان کے اعصاب شیرش ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہوں گی تو آ جائیں گی؟"

"ہاں، انہیں آنا چاہیے؟ سیدھو صاحب بولے: "اب کچھ نہیں ہو گا۔ کیوں امتیاز؟"

"وچی ہاں ڈیڈ؟" امتیاز نے تائید کی۔ "ہونا کیا ہے؟"

کلب کی زندگی معمول پڑ گئی۔ امتیاز پیتا تو سیدھو صاحب موجود رہتے اور چوتھے پیگ کے بعد اس کا کلاس اٹھا کر میز کے نیچے رکھ دیتے۔ امتیاز جھوٹا ہوا مسکراتا اور سیدھو صاحب اسے بازو میں سمجھت کر لے جاتے۔ سب لمبر سیدھو صاحب کی شرافت اور احسان ذمہ داری کی تعریفیں کرتے اور ایک روز تو ماجد صاحب نے بھی کہہ دیا کہ اگر سب کی پیٹیٹ سیدھو صاحب کی طرح ہو جائیں تو سو شلزم اپنی ہوت آپ مر جاتے۔ پھر ایک روز ماجد صاحب اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے آتے۔ ان کے گرد مزاج پُرسوں کا ہجوم ہو گیا۔ سب جیزاں ہوتے رہے کہ زوس بریک ڈاؤن کے بعد مسنون ماجد کی جلد کیسی چمکتے فکی ہے اور ان کی رنگت کے صندل میں کچھ ایسا اجالا سا کیا ہے جیسے ان کے اندر ٹیوب لائست ہو رہی ہے۔

سیدھو صاحب موجود تھے۔ انہوں نے امتیاز کو چار پیگ کے بعد سیٹھا اور لے گئے۔ امتیاز نے مسنون ماجد کو دیکھا ہی نہیں۔ ماجد صاحب نے بھی تواب ہال کمرے کے

آخری کونے کی ٹیبل سنھال لی تھی۔

ایک رات سیٹھ صاحب نے ایک سینئر ممبر کے پاس جا کر اعلان کیا کہ اب امتیاز ایشیائی معاشرے میں شراب کے آداب سیکھ گیا ہے اور انہوں نے اسے فرست ڈویژن میں پاس کر دیا ہے۔ اس پر دیر تک تھقہ پڑتے رہے اور مسز ماجد اور ماجد صاحب یوں مسکراتے رہے جیسے یہ سارا کام اپنی کی تحریک سے ہوا ہے۔

اب سیٹھ صاحب نے کلب آنابند کر دیا۔ امتیاز اسیلہ آتا، مگر چار سیگ کی حد بندیاں چلانگ کر کیں سے کہیں نکل جاتا۔ آٹھ ہوتے ہی وہ اٹھتا اور گرپٹا۔ دائرة بناتا، میزوں تپائیوں کو الٹا کر سیوں کو گھیٹتا یہاں سے دہان پکارتا پھرتا۔ عورت۔ اے عورت۔ اے عورت صاحبہ!

عورتیں کلب میں موجود ہوتیں، مگر امتیاز کا عورت کو پکارنے کا انداز اتنا بے تخصیص اتنا ایسٹر کٹ ہوتا تھا کہ سب اپنے اندر احساس تفاخر بھی محسوس کرتیں اور اس کی حرکتوں پر ہنسنی بھی چلی جاتیں۔

مگر چند دن کے بعد یوں ہوا کہ امتیاز آٹھ ہونے کے بعد اپنی نشست سے اٹھا تو گرتا پڑا گھوتا، دائرة بناتا اور ”عورت عورت“ پکارتا ماجد صاحب کی ٹیبل کے پاس جا پہنچا۔ عورتوں نے امتیاز کی معنوں کی حرکات پر ابھی ہنسنا ہی شروع کیا تھا کہ امتیاز مسز ماجد کے سر پر جا گھٹا ہوا اور سارا کلب ناٹے میں آگیا۔

ماجد صاحب مُرخ چہرے لئے اٹھ گھٹرے ہوتے ”فرمایتے“

”عورت؟“ امتیاز مسکرا یا۔ اس کی آنکھیں آدمی سے بھی کم کھل رہی تھیں۔

”عورت!“ ماجد صاحب کٹ کے ”کون سی عورت؟“

”کوئی بھی عورت!“ امتیاز بولا۔ ”بس ایک عورت۔ تمام پاس کرنے کے لئے“ پھر اس نے جھک کر مسکراتے ہوئے مسز ماجد کو مخاطب کیا۔ ”اے عورت صاحبہ!“

مہر جمع ہونے لگے۔ ماجد صاحب آگے بڑھے اور امتیاز کو دونوں گندھوں سے پکڑ کر بولے "یہ عورت یہری ہی ہے مسٹر امتیاز۔ اگر آپ کو عورت کی ایسی ہی طلب ہے تو آئیے میں آپ کو عورت بلکہ عورتوں کے پاس لئے چلتا ہوں۔" "وہ چلتے؟" امتیاز قدم اٹھانے کی کوشش میں رکھڑا یا "مگر ایک شرط" "کیا شرط؟" ماجد صاحب نے پوچھا۔

"شرط یہ کہ جو بھی عورت ہو، ایسی ہی فرست کلاس عورت ہو۔" امتیاز نے مسٹر ماجد کی طرف انگلی اٹھائی اور دیتے تک اٹھاتے رکھی۔

"اس سے بھی بڑھیا۔" ماجد صاحب بولے "آئیے"

اور ماجد صاحب کی گرفت میں آیا ہوا امتیاز دُور تک حیرت کااظہار کرتا گیا۔ اس سے بھی بڑھیا اکیا اس سے بھی بڑھیا کتنی ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی؟" "ہو سکتی ہے۔ ہو سکتی ہے؟" ماجد صاحب اسے کھینچنے لئے جا رہے تھے اور سارا ہلب ہٹکا بٹکا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ماجد صاحب یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہے جیسے اور کیا کرنے والے ہیں۔

ماجد صاحب نے امتیاز کو بڑی مشکل سے اپنی کار میں بٹھایا۔ امتیاز سارے راستے ماجد صاحب کو چونتا رہا اور ان کی گرد میں بازو ڈال کر ان سے اظہار محبت کرتا رہا۔ ماجد صاحب کی کار سیٹھ فواز احمد جبی کے محل میں داخل ہوتی اور پورچ میں رک گئی۔ پھر کار سے اترتے ہوئے ماجد صاحب نے امتیاز سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں یا آپ کو ابھی بلتا ہوں؟"

دوسری ہی ہو ماجد ڈیپر، امتیاز عجیب سرخوشی کے عالم میں تھا۔ آپ کی مسٹر کی سندل میں گندھی ہوتی ہے؟

"انشار اللہ" ماجد صاحب بولے "آپ جب تک ذرا سا سو بیجتے۔"

ماجد صاحب نے سیٹھو صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا۔ سیٹھو صاحب اندر کسی کمرے میں شاید پر رہے تھے مگر سر پر یہیں رومال باندھ رکھا تھا جیسے نماز پڑھ رہے تھے۔ گھبرا تے ہوتے آتے ہیکیا بات ہے ماجد صاحب۔ رات کو، اس وقت ہے۔

”کوئی خاص بات نہیں سیٹھو صاحب“ ماجد صاحب اٹھ کھڑے ہوتے ہے۔ ”ایک چھوٹی سی بات ہے۔ اگر آپ بیگم صاحبہ اور اپنی صاحبزادی کو بھی بلاعیں تو بڑا کرم ہو گا۔“ سیٹھو صاحب پلٹتے ہیں۔ ”یقیناً یقیناً۔“ مگر پھر رُک گئے۔ ”کوئی ناک بات معلوم ہوتی ہے؟“ ”جی نہیں۔ اتنی ناک بھی نہیں۔“ ماجد صاحب بلوے۔ سیٹھو صاحب سوچتے ہوتے چلے گئے۔ پھر اپنی بیوی اور بیٹی کے تہراہ واپس آتے۔ دونوں شب خوابی کے لباس میں تھیں مگر انہوں نے بڑی بڑی چادریں اور ٹھلی تھیں۔ ان کے چہروں پر تشویش تھی۔

”میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔“ ماجد صاحب باہر لپکے۔ پھر وہ امتیاز کو سہارا دیتے ڈرائینگ روم میں واپس آتے۔ اسے ایک صوفی پر بٹھایا اور بولے: ”یہ لمحے مسٹر امتیاز۔ میں نے اپنا دعہ پورا کیا۔ یہ ہیں آپ کی بہن اور یہ ہیں آپ کی ماں۔ یہ دونوں بھی عورتیں ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟“

امتیاز دیوانوں کی طرح ماجد صاحب کو دیکھا رہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر پتوں کی طرح بک کر رونا ہوا صوفی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ماں، بہن اور آپ اس کی طرف بڑھے اور ماجد صاحب نے سینہ پھلا کر اپنے چھپرے یوں بھرتے ہیے مدت سے ہوا کو ترس رہے تھے۔

جوہما

کرٹوں ایک قول پارٹی میں برسوں تک تالی بجا بجا کرتاں دیتا رہا۔ پھر آواز لگانا
بھی سیکھ گیا۔ پیچھے سے آگے آگیا اور ٹرے قول کے گھنٹے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب
ٹرے قول کو تشویش لاتی ہو گئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ نکل جاتے چنانچہ اس
نے کرمون کو چڑا کر دیا۔ کرمون کی آواز تو حاجی سی خنی مگر اس نے قولی کے گُسکیجھے تھے
اور ہار ہونیم کی آواز میں اپنی آواز چھپا لینے کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنی
قولی پارٹی بنائی اور عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ کے جمگھٹوں میں گاتا رہا اور اپنے
تینوں بچوں کو پڑھا تھا۔ دراصل ٹرے قول کے ساتھ اسے مک کے ٹرے بھے
شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے بچوں
کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بھلاتے یا
قولوں کے پیچھے بیٹھتے تالیاں پیٹھتے پھریں گے اور اس کی طرح اور اس کے باپ دادا
کی طرح ان کی باچپیں بھی ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے مکوں میں داخل کرایا تھا تو سارا گاؤں
بھی سنا ٹے میں آگیا تھا۔ لوگ کہتے تھے، حضرت آدم کے آسمان سے زمین پر
اٹرنے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پہلا میراثی ہے جسے اپنے بچوں کو تعلیم

دینے کی سوچی ہے۔ چودھری نے اُسے دارے پر بُلایا اور ڈانٹا۔ ”شرم کر کر مون
میراثی ہو کر اپنے پتوں کو پڑھاتے ہوئے کیا شادیوں میں اُن سے لوگ ڈھول شہناہی
کی بجا تے کتابیں نہیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں ناس مارتے ہو اپنے
نسی پلیشے کا؟“

کرمون یہ سب سُنتا رہا اور جیپکارہ۔ البتہ مُسکرا تارہ۔ چودھری کی اس ڈانٹ پر
کاب کچھ بکو بھی، اس نے کچھ کھا تو بس اتنا کم۔ ”اقبال قائم۔ عمر بھر وال ساگ
کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ، بیٹیر کا سالن حکھنے کو جی چاہتا ہی ہے؟“

کرمون نے قولی کے نام پر جھینیں اور ٹرھکیں مار مار کر پیسہ جمع کیا اور زپتوں کو یوں
پڑھایا کہ وہ گرمیوں کی پھیلیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے
پھر دہ نہ جانے کیا پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے ہونے سے شرما تے بھی
نہیں تھے۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم کرمون میراثی کے بیٹے ہیں مگر چودھری کی طرح ہماری پڑھی
بھی تو حضرت آدم ہی سے ملتی ہے۔“

پھر یہ لڑکے اوہر لہور، کالاشاہ کا کو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہو گئے
اور باپ کو ہر ہیئت اتنا بہت سارہ پیر بھیجنے لگے کہ کرمون اپنی قول پارٹی توڑ کر اپنے گھر
میں رہنے لگا اور صاف سترے کپڑے پہنے لگا اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال
اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چودھری نے یہ سناتا اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے
لگا۔ ”حرام کی اولاد؟ اس نے کہا۔“ اتحلاک میں کہیں کا۔ دیکھ لینا لوگو، سال دو سال میں
خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہو گا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آگئی تو۔ ایک میراثی جب
زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو سورج سوانیزے پر اترنے کو ہے۔ اور چودھری پھر یوں
ہنسنے لگا جیسے رد نے لگا ہے۔

کسی نے کرمون کو چودھری کی یہ بات بتائی تو وہ بولا۔ ”چودھری کیوں خفا ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر ابھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا۔
آہستہ آہستہ حقدار ہو جاتے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے،"

جن لوگوں نے کرمون کو چودھری کی بات بتائی تھی انہوں نے چودھری کو کرمون کی
بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چودھری شربت پی رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے
اچھو ہو گیا اور شربت اس کی ناک سے بسنے لگا۔

پھر ایک روز کرمون گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ ہا ناک رہا تھا۔ با توں با توں میں
کہنے لگا "میں میراثی ہوں پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں اس لئے جی چاہتا ہے یہاں
گلی میں بیٹھنے کی بجائے ایک پتی بیٹھاک بنواؤں۔ اس میں پنگ اور مونڈھے بچھادوں اور
تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کی اچھی اچھی، پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے
کے لئے چودھری کا دارا تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بل کھڑا ہوں
یہ بات کر کے وہ اپنے گھر گیا۔ حقہ تازہ کیا۔ چشم پر ٹاگ سجانی اور کش لگانے کے لئے
چار پانی پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چودھری کی طرف سے اسے بلدا آگیا۔ اس نے دارے پر
قدم رکھا ہی تھا کہ میں چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرا دیا اور چودھری کا پلا ہٹوا منشی اس
کی پیٹھ پر جوتے بر سانے لگا۔ ساتھ ساتھ چودھری اسے گایاں دیتا رہا اور کہتا رہا "بیٹھاک
بناتے گا کمینہ، دارا لگاتے گا میری طرح، چار پیسے کیا آگئے کہاںی اوقات ہی بھول گیا
روزیں۔ لگاؤ۔ اور لگاؤ۔"

کرمون کو اتنے جوتے لگے کہ اگر کسی اور کو لگتے تو وہ گلتی بھول جاتا، مگر کرمون گناہ
رہا۔ "میں تو گناہ رہا۔" اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔ میں تو گناہ رہا تاکہ قیامت
کے دن خدا کے سامنے جو توں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جاتے۔ باسٹھ
لگے تھے، باسٹھ پورے کروں گا خدا کے حضور انشاء اللہ۔ ایک کے ستر نہ سہی چودھری
کے لئے تو میرا ایک ہی جو تباہت ہے سارے جہان کی مخلوق کے سامنے"

انہی دنوں دوٹ درج ہو رہے تھے۔ دوٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آتے اور کرموں کا دوٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا۔ ”بھتی تم اپنا نام کر مانتے ہو مگر کہا کیا نام ہوا اکرم الہی ہو گا، یا اکرم علی یا اکرم دین۔ کہا کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے اصلی نام کا بلکہ اڑ معلوم ہوتا ہے۔“

کرموں بولا۔ ”میں میراثی ہوں جی، اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بلکہ اڑ تو کرموں ہے جیسے میرے باپ کو لوگ کرموں کہتے تھے پر اس کا اصلی نام کا ما تھا۔“ زچ ہو کر انہوں نے فہرست میں ”کرمادل گاما ذات میراثی پیشہ گدگری“ کے الفاظ لکھنے تو کرموں بچڑھ گیا۔ ”نیں صاحب جی۔ میں گدگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں تو عمر بھرا پتی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے پچھے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلا چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گدگر کیسے ہو گیا۔ گدگری اتنی ستی ہے تو چودھری کو گدگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔“

چودھری کو خبر ملی کہ کرموں نے دوٹ درج کرنے والوں کے سامنے اسے گدگر کہا ہے۔ اسے فوراً دارے پر بلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی تے اسے بھوتے لوگوں تے بھوتے لگ رہے تھے جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کمائی جگڑ کر بولا۔ ”بس باسٹھ پورے ہو گئے۔ میرا کوڑ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاوے گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہو گی۔“

”مجھے تکلیف ہو گی!“ چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ ”مجھے کیسے تکلیف ہو گی کیسے؟“

کرموں کے تیور بدے ہوتے تھے۔ بولا۔ ”چلتے آپ کو تکلیف نہیں ہو گی تو آپ کا حساب پورا کرنے والے فرشتے کو تکلیف ہو گی۔“

”میرا حساب ہے“ چودھری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پنگ ہی پر کھڑا ہو جاتے
گا یہ کیا بھتے ہو؟ میرا حساب کیسا؟“

”بھی یہی، غریبوں کو جوتے لگوانے کا حساب۔ ایک کے ستر یعنی کرمون مزید
جوتوں کا انتظار کئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پچھلی اٹھا کر اسے جھاڑ
رہا تھا۔ اب آپ خود حساب لگایجھے اقبال فاقم، کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ دہ پہلے
کل ہوتے، خدا آپ کا بھلا کرے، ایک سوچو بیس۔ قیامت کے دن اگر ایک کے
سترنگیں گے تو ایک سوچو بیس کے سنتے لگیں گے۔ منشی جی، حساب لگا کر بتادو
چودھری جی کو۔“

چودھری نے غصتے میں اپنے جوتے کی طرف ہاتھ ڈھندا یا مگر جب دیکھا کہ
دارے پر موجود بیشتر لوگ کرمون کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ دا پس
لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک نکالا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں ہیں یوں
مسلسلہ وہ سفوف سابن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہنزوٹوں پر کپکپا تی رہ گئیں۔
اس وقت پرندے والیں آشیانوں کو جارہے تھے۔ شام قریب تھی۔
چودھری اس واتھے کے بعد کرمون سے بہت سنبل کر بات کرنے لگا۔ کرمون
میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ
سوچ سمجھ کرتے ہیں، جیسے امریکی روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم
جب چودھری کے دارے پر سے فالتو لوگ اٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی
رہ جاتے تو وہ جلدی دل کے پھچپوے پھوڑتا۔ ”اب یہ کمینہ کڑوی گولی کو خوک دیتا ہے۔
اب میں اسے شکر چڑھی گویاں کھلاؤں گا۔“ پھر وہ حالات کے طویل تجویزیں ہاصوف
ہو جاتا۔ ”لوگ کہتے ہیں شراب کافشہ بڑا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں تو دو لیتوں کے لئے
روپے کا نشہ اس سے بھی بڑا ہے۔ کرمون کو دیکھو۔ کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ

ہتھا تھا، اقبال قائم، اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوں میں چلا جاتا تھا، اور کہاں یہ دن
کہ کل کہنے لگا۔— میں ادھر لا ہو، فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہئے
تو لیتا آؤں، کوئی چھپڑی وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپے کافی ہے۔ ”چھپڑی
نے گردن کو کھینچنے کی حد تک کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔“ کہیں وہ کسی کو نے
کھدرے میں بیٹھا تو نہیں ہے حرام کی اولاد۔ یاد ہے ایک بار میں یہیں دارے پر
اسی کی باتیں کر رہا تھا اور انہیں میں مجھے تیر پلا تھا کہ وہ کمینہ بھی ایک طرف بیٹھا
ہے؟ میں نے اس نسلی کنگلے کے نتے ٹھاٹھ کی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوئا اگر
مور کے پر سجائے تو بھی کوئا ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ۔ میری چلیں بھرنے والا۔
میرے عجبل صاف کرنے والا۔— بھرے دارے میں بولا۔ ”ویسے چودھری جی۔
سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوئے ہی کی نسل میں سے ہے۔ صرف زنگ دار پر نکال
لتے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا ہے!“— یاد ہے نا، روپے نے اتنے حصے بڑھا دیتے
ہیں اس افلاطون کے پتھے کے، ورنہ یہاں میرے سامنے تی کی طرح منمنا تا چھرتا تھا۔
روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جو تے بھر کی کر دی ہے۔ مگر مجھے بھی ایسے
نو دلتیوں کو آپے میں رکھنے کے گزر معلوم ہیں۔ جو تے پر چاہے سنرا کام ہتوا ہو،
رہے گا تو وہ جوتا ہی۔ اور پاؤں ہی میں پہنچاتے گا۔ اس میراثی کے پچے کو میرے
گاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہو گا۔ دیکھو لینا۔“

سردیوں کے دن تھے۔ کہ موں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس
آیا تو اس نے سنترے زنگ کا کبل اور ڈھر کھا تھا۔ لوگ اس کبل کو چھوتے تو
حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیرٹ کی اُدن اتنی زرم بھی ہو سکتی ہے؟ کہ موں کے ایک
رشتہ وار نے اس کبل کو چھو تو بسم اللہ پڑھ کر کبل کا کونا منہ میں ڈال لیا اور بولا۔ ”سوچی کا
حلوہ ہو تو ایسا ہو کہ جب جی چاہا اور ڈھلیا، جب جی چاہا کھالیا۔“

خود کرموں ملنے والوں کو بتا تارہا کہ پورے ایک سو کا ہے۔ اور پھر صرف خوبصورت ہی نہیں ہے۔ اندر سے بھی بڑا گنڈا ہے۔ باہر رفت گردہ ہو تو کمل میں انگیٹھی سی دلکشی رہتی ہے۔ پوہ کی ٹھنڈی میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے، بختن پاک کی قسم!

پوری بستی میں اس کمل کے چرچے ہونے لگے۔ بات چودھری تک بھی پہنچی گریوں کے کرموں کو مرہا تھا۔ ایسا کمل تو چودھری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا۔ اس پر چودھری یوں سُکرا یا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سراچھری سے چیردیا ہے۔ کرموں کے روپے نے چودھری کو سیاستدان بنادیا تھا۔

ایک دن کرموں یہ کمل اور ٹھنڈے چودھری کے دارے کی گلی میں سے گزرا تو چودھری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کرموں کو بلایا اور اس کے کمل پر راٹھ پھیر کر بولا: "کہاں سے مارا؟"

کرموں پاس ہی ایک سل پر بیٹھ گیا۔ "میں نے تو۔۔۔ اقبال قائم۔۔۔ ساری عمر میں ایک پتا اتنا کہ نہیں مارا، کمل کہاں سے ماروں گا۔ اور پھر کمل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھوڑا تو میں نے آپ کے روٹے کھڑے ہوتے دیکھئے۔"

چودھری کا چہرہ چھوڑ یوں تن گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ خربوزے میں ایک اور چیرڑپا اور چودھری بولا۔ "چلو مارا نہیں تو لیا کہاں سے؟"

کرموں نے جواب میں لمحہ بھردیر کی۔ اس کی آنکھیں چکیں۔ اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتیوں میں رکھتے ہوتے چرانخوں کی لوین جل اٹھی ہیں۔ "کالاشاہ کا کوئی میرا بیٹا ہے نام فراز۔۔۔"

"ہا۔۔۔ وہ سرفراز!" چودھری نے کرموں کی تصحیح کی۔

"جی ہا۔۔۔ وہی سرفراز۔۔۔" کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی۔ "وہ کہنے لگا کہ بیبا۔ اب کے یہاں سے ایک اچھا سا جوتا لے جاؤ۔۔۔ میں نے کہا، بیٹے۔ جو تے

ادھر گاؤں میں بہت ہیں۔ کچھ اور لادو۔ کوئی تحفہ چیز۔ وہ یہ کمبل لے آیا۔ میشیا میں اس کے کسی دوست کا آباد ہتا ہے۔ وہ یہ کمبل اپنے بیٹے کے لئے لایا۔ سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لئے خرید لیا۔“

چودھری بولا۔“ دیکھو کر موں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیئے۔ تو۔؟“

”تو لے لیجئے نا۔ اقبال فائم۔“ کر موں نے گر ج کر جواب دیا۔“ سرفراز پوچھے گا تو کہ دون

لگا کہ چور لے گئے۔“

چودھری نے کر موں کی بات زور کے ایک قہقہے میں اڑانے کی کوشش کی گئی۔
مسلموم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔“ اس کا کیا ہو گے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ اقبال دام۔“ کر موں کی آواز میں ڈری آسودگی اور بے نیازی تھی۔

”مگر میں مُفت نہیں لوں گا۔“ چودھری بولا۔“ یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ مُفت چیزیں دیتے ہیں، لیتے نہیں ہیں۔ تم تو جانتے ہو۔ تمیں تو عمر بھر کا تجربہ ہے۔“

”جی ہاں۔“ کر موں نے کہا۔ پر کبھی کبھی لینے والوں پر دینے کا وقت بھی آجائتا ہے۔ اقبال فائم۔ لے لیجئے نا۔ سرفراز مجھے اور بیچج دے گا۔“

”نہیں کر موں۔“ چودھری بولا۔“ تم ہمارے میراث ہو۔ تمہارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مانگو گیا مانگتے ہو اس کمبل کا۔ سرفے نے تمیں بتایا تو ہو گا کہ اس نے کمبل کے کتنے روپے دیتے تھے۔“

”جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا۔“ کر موں کی آواز میں منصوبہ سازی کی گمراہی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نیچے پر پہنچ کر سکر لے لگا اور بولا۔“ کمبل دوسرے ہاک کا ہے ناجی۔ میں نے کہا بھی سرفراز سے کہ اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ بولا۔ کوئی بھی چیز ہمارے ابا کے آرام سے منگلی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے۔ تعلیم نے رکوں کے دماغ بگلاڑ دیتے

ہیں اقبال قائم — قیمت کچھ زیادہ ہی ہے؟

”یعنی اتنی زیادہ ہے کہ سرفما میراثی یہ قیمت ادا کر سکتا ہے اور میں نہیں کر سکتا؟“

چودھری اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پُندی طرح نہ چھپا سکا۔

”بتاب و کتنے میں آیا ہے۔ پچاس، سو، دوسو، تین سو — کتنے ہیں؟“

”تین سو تو خیر نہیں جی۔“ کرمون نے چودھری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے جوتے لگانے سے پیدے غشی نے کرمون کو دیکھا تھا۔ ”کل دوسو باسٹھ میں آیا ہے۔“ اس نے حاضرین پر داد طلب نظری ڈالیں۔

”اور اتنی رقم تمہارے بیٹے نے ادا کر دی؟“

”وکم اتا کجا تا ہے نا اقبال قائم،“

”تو تم مجھ سے دوسو باسٹھ روپے لو گے؟“

”آپ باسٹھ رہنے دیجئے۔ ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دوسرے دے دیجئے۔“

”دوسو باسٹھ میں باسٹھ اور ملا کر کیوں نہ دوں؟“ چودھری نے فاتحانہ انداز سے

کہا۔ ”آخر رقم ہمارے میراثی ہو۔“

”چلتے زیادہ دے دیجئے اقبال قائم — تین سو بیس دے دیجئے۔“

”تمہیں تو دو کانڈاروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آگیا!“ چودھری نے نے دل گی کرنے کی کوشش کی۔

اور کرمون کبل اتارتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اب بے حساب آخر کرتا ہوں اقبال قائم۔“

بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کا حساب آتا ہے؟“

چودھری نے کرمون کے چلا کر ہوئے چاہک سے بے نیاز ہو کر اپنے منشی

سے کہا۔ ”لو بھی دے دو اسے تین سو چوبیس۔“

”روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے!“ روپے کے لفظ پر زور دیتے ہوئے

کرمون نے منشی کو تاکید کی۔

”ردو پے نہیں تو پیسے ہو“ منشی نے تمیض کے نیچے ہپنی ہوئی داسکٹ کی
اندر ورنی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا انکالتے ہوئے پوچھا۔

”میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس ردو پے دینے کی بجائے تین سو چوبیس
جو ہوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں“

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسنے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ
پہچانا جاسکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ میں کی ایک چادر ہے جس پر
کنکروں سے چاند ماری ہو رہی ہے۔

کرمون نے روپے لئے اور مسکرا تاہو اپلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کبل چھلیو اکر مسکرا یا۔ اسے خوب اچھی طرح جھنڈا یا
بھیسے کبل کا میراثی پنا انکال رہا ہے۔ اسے تکڑا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔
”کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور بھر کسی پیٹی میں بھینیک دیں“ بھروسہ حاضرین
سے مخاطب ہوا۔ درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی
کو ڈھاتی تین سور و پے کا کبل اور ڈھے دیکھنہیں سکتا تھا۔ جو ہوتے کو پاؤں ہی میں رہنا
چاہیئے۔“

اندماں

پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اترنے کا احساس بالکل اس احساس کے مشابہ تھا جو آج سے چوبیس سال قبل، پہلی بار ڈھاکے کے ریبوے سٹیشن پر اترنے ہوتے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ پھر اس دوران میں جلال الدین نے ڈھاکے سے یہاں تک اور یہاں سے ڈھاکے تک سختی بہت سی پروازیں کی تھیں پہلے چار گھنٹے لا اسٹر تھا لے پھر تیرنماز طیارے آئے تو وہ ڈھاتی گھنٹے میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان پہنچ جاتا تھا، مگر آج وہ ڈھاکے سے چل کر ڈھاتی میں بعد مغربی پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔ اب کے وطن کے ایک حصے سے وطن کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لئے اسے پورا جنوبی ایشیا طے کرنا پڑا تھا ڈھاکے سے کلمتا، وہاں سے ٹنڈہ پھر کھٹکا دو، کھٹکا دو سے بنکاک اور بنکاک سے یہاں! اس نے سوچا بعض آزادیاں بظاہر کیسے ماقابل فہم شارٹ کٹ سے ایک دم آدمکتی ہیں مگر اس سے نک کے ایک قریبے سے درہرے قریبے تک کے فاصلے کتنے بڑے جاتے ہیں۔

طیارے کی کھڑکی میں سے جلال الدین نے دیکھا کہ سیر ہی طیارے کی طرف لائی جا رہی ہے اور ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر جنگل کے ساتھ ساتھ لوگوں کی قطاریں کی آنکھیں طیارے کے دروازے پر گڑای ہوئی ہیں کہ کب سیر ہی لگے، دروازہ کھلے

اور اس میں سے ان کے پیاروں کے انوس چہرے نمودار ہوں۔

مسافر اپنے اپنے بیگ اور بریف کیس سنجال کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر جلال الدین دور جنگل کے ساتھ لگے ہوتے مردوں اور عورتوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ شاید طاہر کو کسی طرح اس کی آمد کا علم ہو گیا ہو۔ دور سے ان چہروں کے خلط و اضطراب نہیں تھے۔ سب ایک جیسے لگتے تھے۔ اور پھر اچانک اس کے اندر جیسے ایک انار سا چھوٹا اور سارے چہرے روشن ہو گئے۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ وہ سب ظاہر تھے۔ وہ سب پاکستانی تھے۔ اس کے جی میں یہ تمنا امداد پڑی کہ وہ در داڑہ کھلنے کا انتظار کرتے بغیر کھڑکی میں سے کسی طرح باہر نکل جاتے اور ہر کی طرح قلاں پنچیں بھرتا ہوا، ہوانی اڈے کی دوسری منزل پر پہنچے اور سب سے ایک ایک کر کے لپٹتا چلا جاتے۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "چلو اٹھو عابدہ" پھر وہ چونک پڑا اور جھجک کر آہستہ سے کہا۔ "سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آخر یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

"تماشا ہے" عابدہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے گھوڑا۔

"ارے!" وہ سیست پر بیٹھ گیا۔ "نہ ہست بیٹی قم بھی رو رہی ہو؟"

ائی�لان کی ایک ہوش نے قریب ہکر بہت میٹھی اور ملام انگریزی میں اُن سے پوچھا۔ "میں کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ" جلال الدین گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اس نے طیارے میں اعلان کر دیا۔ "ہم مشرقی پاکستان سے آ رہے ہیں۔ ہمارا نوجوان داما دیہیں کہیں چنانچہ میں رہ گیا ہے۔ وہ رشتے میں بیری بیوی کا بھانجا بھی تھا، ہم پاکستان سے پل کر پاکستان آ کر ہیں تو اب بیری بیوی کو اپنا بھانجا یاد آ رہا ہے۔"

"اوہ!" ایک ہوش نے اس ایک لفظ میں نہ جانے افسوس کا انخلاء کیا اتعجب کا۔

پھر وہ نزہت پر جگلی اور آنسو پوچھنے کے لئے اسے اپنارو مال پیش کرتے ہوتے بولی۔ "مدت رو پیاری لڑکی خدا کرے گا تمیں تمہارا میاں مل جاتے گا،" پھر وہ چونک کہ سید حبی کھڑی ہو گئی اور جلال الدین سے پوچھا ہے "یہ آپ کی بیٹی ہے نا؟"

"جی" جلال الدین بولا۔ "اس کی شادی چھسات ماہ پلے ہوتی تھی"

"اوہ!" اب کے ہوش کے اس لفظ میں واضح طور پر دکھ تھا۔ پھر وہ نزہت کے سامنے جگلی اور بولی "میں وعدہ کرتی ہوں پیاری لڑکی کہ اگر ہماری ایم لائن نے ڈھلکے کی سردوں شروع کی تو میں وہاں جب بھی جاتوں گی، تمہارے میاں کو تقاض کروں گی اور اسے تمہارے پاس کر اچی پسخاکر دوں گی۔ وعدہ رہا۔ لوٹا تھا ملا ملا"

نزہت آنسوؤں میں مسکرانے لگی۔ اس نے بڑے پیار سے ہوش کو دیکھا، اس سے ہاتھ ملایا، پھر مشین کی سی تیزی سے پر س کھولا اور ایک کتاب میں سے ایک تصویر نکال کر ہوش کو تھادی۔

"اوہ، سویٹ!" ہوش بولی۔

"اس کا نام اشرف ہے،" جلال الدین بولا۔ "اشرف رضا۔ جنگ کا بھی کچھ ایسا زور نہیں تھا جب وہ ادھر چلا گانگ کی طرف دو تین دن کے لئے گیا تھا پر دو تین ماہ تک واپس نہ آیا۔ ادھر ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی۔ ہم ڈھاکے سے بھاگے اور یہاں پہنچنے میں ڈھانی میلنے اور لگ گئے۔ یوں سمجھتے کہ اشرف چھ ماہ سے لاپتہ ہے۔ لاپتے میں اس تصویر کے پیچے اس کا نام اور رہائش اور محلے کا پتہ وغیرہ لکھ دوں۔"

"کیوں؟" نزہت نے اشرف کی تصویر ہوش کے ہاتھ سے اپک لی۔ "یہ تو میری تصویر ہے۔ میں کیوں دوں کسی کو۔" پھر پس کھول کر تصویر اس میں رکھتے ہوتے بولی۔ "ایک تصویر امی کے پاس بھی تو ہے۔ وہ دے دیجئے نا؟"

تمینوں مسکراتے۔ عابدہ بیگم نے اپنا پس کھول کر اشرف کی تصویر نکال دی۔

جلال الدین نے اس کی پشت پر ساری تفصیل اور پھر پاکستان میں ظاہر کا پتہ بھی لکھ دیا۔ ہو سٹس نے تصویر لیتے ہوئے اپنا وعدہ دُہرا یا کہ وہ اشرف کو ملاش کر کے دم لے گی۔

یک ایک جلال الدین نے دیکھا کہ طیارہ بالکل خالی ہو چکا ہے اور ایئر لائن کی ایک اور ہو سٹس جو دروازے پر مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی تو ان سے فارغ ہو کر ان کی طرف آرہی ہے آتے ہی وہ بولی۔ "معاف کیجئے گا —

مگر جلال الدین نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ "ہم معافی چاہتے ہیں۔ درصل —" مگر اب کے پہلی ہو سٹس نے جلال الدین کی بات کاٹ دی اور کسی یورپی زبان میں ہو سٹس سے باقی کرنے لگی۔ اس نے اشرف کی تصویر بھی دکھانی۔ اس دوران میں جلال الدین، عابدہ بیگم اور نزہت سیڑھی کا آدھا حصہ طے کر چکے تھے۔ دونوں ہو سٹسیں پاک کر آئیں اور آخری زینے پر نہایت پیار سے انہیں خدا حافظ کہا۔
مگر جلال الدین اس آخری زینے پر رُک گیا۔ ذرا سے انتظار کے بعد عابدہ بیگم بولی۔

"چلنے نا۔ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اور جلال الدین بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو کیسی یہ بھجے کرنٹ نہ مار دے!" پھر وہ ہنسنے لگا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کے باختہ پکڑ کر بسم اللہ پڑھی اور زمین پر پاؤں رکھ دیا۔

سب کے جسموں میں ایک سنی سی دوڑگی۔ خوف کی طرح کبھی کبھی مکمل تحفظ کا احساس بھی تو جسم میں کیپکی پیدا کر دیتا ہے۔

ایئر پورٹ کی بالائی منزل استقبال کرنے والوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔
مگر ہوا اتنی تیز پل رہی تھی کہ ان کے لباس پھٹکھٹا رہے تھے اور جلال الدین کو یوں حسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر ان سے لپٹا پڑ رہا ہے۔ غیر ملکی ہو سٹسوں نے جس

ہمدردی اور انسانیت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے جواب میں جلال الدین کا وطن سے محبت کا جذبہ چاہتا تھا کہ کوئی پاکستانی اس کی طرف بھاگتا ہوا، اسے پکارتا ہوا بازو پھیلاتے ہوئے آتے اور کہ کہ اے میرے بھڑے بھائی ادھراس رستے سے آؤ جہاں میں نے تمارے لئے اپنی آنکھیں بچھار کھلی ہیں۔ آؤ میں تمیں اپنے سر پر بٹھا لوں، مگر — جلال الدین نے سوچا — یہ ہوانی اڈہ ہے جہاں سب لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں۔ آخر کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں — چنانچہ اہل شرکی بجائے اس نے شہر کی ہوا سے یہ تسلیم حاصل کر لی اور عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا۔ ”دو کیجا، پاکستانی ہوا کیسے ہمارے کپڑوں میں گھس کر ہمارے گدگدی کر رہی ہے!“ اس پر نزہت یوں گلکی جیسے کسی نے سچ مج اس کی قیصیں میں پانچ دال کر اس کی پسلیوں پر انگلیوں کی پوریں دوڑا دی ہیں۔

ہوانی اڈے پر قدم رکھنے سے لے کر ہوانی اڈے کی عمارت سے باہر آنے تک جو شخص بھی سامنے آیا، وہ اسے اپنا شناسا لگا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ اسے دیکھ کر رُک کیوں نہیں جاتے، چونکہ کیوں نہیں پڑتے، ”ہیلو جلال الدین!“ کافر نہ لگا کر وہ اسکے سینے سے بھیج کیوں نہیں لیتے۔ ”معاف کیجئے گا!“ اس نے مجسم مسکراہست بن کر لا دنچ میں ایک شخص کو روک لیا تھا۔ ”آپ کا چہرہ جانا پہچانا ساگتا ہے!“

”مگر —“ وہ شخص ہیکلانے لگا۔ ”مگر معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو نہیں پہچاہا۔“ ”میں —“ جلال الدین مسکراتے جا رہا تھا۔ ”میں جلال الدین ہوں۔ محمد جلال الدین۔“ ڈھاکے سے آ رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہیں ڈھاکے میں کہیں آپ سے مل چکا ہوں۔“ ”مگر میں تو ڈھاکے کے کنجی گیا ہی نہیں ۔“ وہ شخص بولا۔ ”آپ کو دھوکا ہوا ہے،“ اور اور وہ جلال الدین کو جیسے دیرانے میں چھوڑ کر آگے طرد گیا۔

”دیکھئے!“ عابدہ نے ہر کا بکا بکھڑے جلال الدین کے پاس آ کر کہا۔ ”لوگوں کو

پچاننا چھوڑیتے اور طاہر بھائی کے ہاں پہنچنے کا بندوبست کیجئے۔“
اور جلال الدین ہوانی اڈے کی عمارت سے یوں نکلا جیسے دوسری بار ڈھاکے
سے نکل رہا ہے۔

اس نے جس بھی میکی ڈرائیور کو چلنے کو کہا، جواب ہلاکہ میر خراب ہے۔ ایک بار
اس کا بھی چاہا وہ ان سے اپنے آپ کو متعارف کرادے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے
منہ سے ہم ڈھاکے سے اُر ہے ہیں“ کے الفاظ میں کہ میکی ڈرائیور اسے پشاں لیں گے۔
مگر اب اسے کچھ یوں محسوس ہوتے لگا تھا جیسے جب وہ اپنا تعارف کراہا ہو گا تو دراصل
بھیک مانگ رہا ہو گا۔

میکی اس ڈرائیور کا بھی خراب ہی تھا جو چلنے پر رضا مند ہو گیا تھا مگر ساتھی اس نے
پندرہ روپے طلب کرنے شروع کیا۔

”پندرہ روپے“، جلال الدین کو صدمہ پہنچا۔ ”پندرہ روپے کیسے میاں؟“
”چلنے بیٹھ جائیے نا آباجی“ نزہت آس پاس سے گزرنے والوں کی ٹولتی نگاہوں
میں گھر کر بولی۔ ”یہ جاتو رہا ہے۔ دوسروں نے توصاف انکار کر دیا ہے۔“
”زیادتی ہے“، جلال الدین نے میکی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

عابدہ بیگم اور نزہت کو کچھی سیٹ پر بٹھا کر اور صندوقچے کو گاڑی کی چھت پر
رکھ کر وہ ڈرائیور کے پلو والی سیٹ پر آبیٹھا۔ ”چلتے حضور“ وہ بولا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ اس شہر میں پہلے کبھی نہیں آتے“ ڈرائیور نے ایک موڑ
کاٹتے ہوئے کہا۔

”لو! ارے بھائی میں تو رجنوں بار آیا ہوں“، جلال الدین ہنسنے پھر مرکر عابدہ بیگم
اور نزہت سے کہنے لگا۔ ”یہ بھائی ہمیں ہمارے میںے باسوں سے گنوار سمجھ رہا ہے
شاید“، پھر وہ ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم ڈھاکے سے اُر ہے ہیں بھائی“۔

”ڈھاکے سے؟“ ڈرائیور یون ہیران رہ گیا جیسے ڈھاکہ مر تنخ کا کوئی شہر ہے۔ پھر اس نے کار کو سڑک کے کنارے لے جا کر روک لیا، سٹیننگ پر سے ہاتھ اٹھا کر انہیں جوڑا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے بھائی صاحب۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ وہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے آئے والوں کو تو ہمیں انہیں پر بھانا چاہیتے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے در نہ میں کوئی ایکسٹرینٹ کر بلیھوں گا۔“

خوشی کے مارے جلال الدین کی انہیں بھیگ لگیں۔ اس نے ڈرائیور کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے دلوں ہاتھوں میں لیا اور اس کی انہیں میں انہیں ڈال کر مسکرنے لگا اور پھر ڈرائیور سے یوں پست گیا جیسے ہوائی اڈے پر اترنے سے لے کر اب تک وہ اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر لیٹ پر عابدہ بیگ اور نزہت مسکرا بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ ڈرائیور نے آستین سے اپنے آنسو پوچھے، کار ٹارٹ کی اور جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ہم بھی کیسے چھوٹے کیسے کہنے لوگ ہیں۔ جو بھی سواری ملتی ہے، اسے لوٹنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ سوچنے کی توفیق نہیں کہ یہ جو شخص نیکی لینے آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی مر گیا ہو، یہ اپنے کسی پیارے کے جنازے میں پہنچنا پاہتا ہو، اس کا پچھہ بیویش پڑا ہو اور یہ ڈاکٹر سے دوالیئے جارہا ہو، ہم بھی کیسے بد نصیب لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر دوسروں کے بچوں کے پیٹ کاٹ لیتے ہیں؟ ڈرایور ڈر کر وہ جلال الدین سے مخاطب ہوا۔ آپ مجھے معاف نہ کر دیتے تو پتہ ہے میں کیا کرتا۔ میں آپ کو پہنچا کر سیدھا ہار بیوے سیشن جاتا اور وہاں کسی گاڑی کے نیچے نر رکھ دیتا۔“

”تو بکرو بھائی، کیسی باتیں کرتے ہو؟“ جلال الدین نے بظاہر بڑی اداسی سے ڈرائیور کا کندھا تھپٹھپایا مگر وہ اندر سے کتنا آسودہ تھا! پاکستان آغرا س سے متعارف ہو رہا تھا!

ڈرائیور اپنی دھن میں بولتا ہی چلا گیا۔ ”آپ لوگ ڈھاکے سے آ رہے ہیں جہاں قیامتیں گزر گئیں۔ پتہ نہیں آپ کہاں کہاں سے لٹ کر اپنے پاکستان پہنچے اور یہاں میں۔۔۔ ایک لیٹرا۔۔۔ آپ کی تاک میں بیٹھا تھا کہ آپ کی ہڈی پر اگر کوئی بونی رہ گئی ہو تو اسے بھی نوچ لوں۔ لعنت ہو مجھ پر۔“

”اب اور شرمندہ نہ کرو۔“ جلال الدین شرمندہ ہونے کی بجائے باغ باغ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم وطنی بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ ایک وہ ڈھاکے کے ہم وطن نے، ایک یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے!

مرزا طاہر بیگ کے گھر کے سامنے جب ٹیکسی رُکی اور ڈرائیور نے چھت پر سے صندوقچہ انکا تو جلال الدین نے عابدہ بیگم اور نزہت کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے پندرہ روپے ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ دالا تو ڈرائیور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں صاحب یہ نہیں ہو گا۔“ وہ بولا۔ اگر آپ میرے سینے میں گھونپنے کے لئے جیب میں سے چاقون کالئے لگے ہیں تو میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں گا، لیکن اگر آپ کرایہ نکالنے چلے ہیں تو میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا تو میرا کرایہ مجھے مل گیا۔“

آس پاس سے لوگ یہ دیکھ کر جمع ہونے لگے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کی بات پر الجھ پڑے ہیں۔ اچھا خاصاً بحوم ہو گیا۔ تب طاہر بیگ گھر سے باہر آیا اور جلال الدین کو سینے سے بھینچ کر اٹھا لیا۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ پھر جلال الدین نے طاہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے عابدہ بیگم اور نزہت کے پاس لے آیا۔ ابھی دوچار ہی باتیں ہوتی تھیں کہ جلال الدین وحشت زدہ ہو کر پٹا۔ ڈرائیور موقع پا کر اچانک ٹیکسی بھگا لے گیا تھا۔ جلال الدین چند قدم اس کے پیچے جا گا۔ پھر رُک گیا اور جیسے سارے بحوم کو مخاطب کر کے بولا۔ ”وہ ایک اصلی پاکستانی جا رہا ہے۔۔۔ سچا اور سکھرا ہے۔“

طاہر بیگ کے قریب آکر اس نے سارا واقعہ سنایا۔ لوگوں نے یہ واقعہ یوں
سانس روک کر سنا جیسے الف بیلڈ کی کہانی سن رہے ہیں۔

اچانک طاہر بیگ کو محسوس ہوا کہ مستورات بہت دیر سے محلے کے ہجوم
میں گھری کھڑی ہیں۔ یہ سب میرے محلے دار ہیں، سب میرے بھائی ہیں۔ وہ انہیں
اندرے جاتے ہوئے بولا، مگر پھر رُک گیا اور، ہجوم سے مخاطب ہوا۔ «معاف کیجئے گا،
یہ میرے بہت عزیز و دوست جلال الدین ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر
آ رہے ہیں۔ ڈھانی تین میٹنے پہلے ڈھلکے سے نکلے تھے اور اب جانے کیاں کہاں
سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ جب آزادیاں ختم ہوتی ہیں تو راستے لمبے ہو جاتے
ہیں۔ یہ لوگ ڈھلکے میں ایک بھرا پرا گھر جھپوڑ کر اس صندوقی کے ساتھ یہاں آتے
ہیں۔ یہ طاہر بیگ نے جلال الدین کے ہاتھ سے صندوق چھپیں کرائے بلند کیا۔

ہجوم میں سے ایک بولا۔ «شاید انہی کے لئے آپ نے وہ والافیٹ کرائے

پر لیا ہے؟»

«جی ہاں، انہی کے لئے۔ طاہر بیگ نے جواب دیا۔ مجھے کھٹمنڈو سے اُن کا خط
ملاتوں نے فوراً ایک مکان کا بندوبست کر لیا۔ یہ سب کچھ میں نے اس لئے عرض
کیا ہے کہاب جلال الدین بھی یہیں رہیں گے۔ اگر وہ اس شہر میں رہیں گے تو پھر
اسی کامونی میں رہیں گے۔ ہم انہیں اور کہیں نہیں جانے دیں گے۔ پھر میں نے یہ
تعارف اس لئے بھی کرایا ہے کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے ہمارے بھائی
ہم سب کی محبتون کے مستحق ہیں۔ یہ ایک بھٹی میں سے تپ کر کندا بن کر نکلنے
والے پاکستانی ہیں۔»

ہجوم میں سے ایک بزرگ بولے۔ «اللہ انہیں برکت دے۔ خدا ہمیں ان
کے زخم مندل کرنے کی توفیق دے۔»

اس بات پر نزہت یکاک پچھے کی طرح بک کر رو دی اور جلال الدین اسے سنبھالنے کو لپکا۔ پھر اداس، جوم منتشر ہونے لگا اور طاہر بیگ تینوں کو اندر لے آیا۔ طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں عابدہ بیگم اور نزہت سے پست پست گئیں اور دیر تک روانے روانے کا دور چلا۔ پھر سب نے ہل کر کھانا کھایا اور طاہر بیگ نے جلال الدین کو بتایا کہ اس وقت اس کے مکان میں مشرقی پاکستان سے آتے ہوئے تین خاندان موجود ہیں درندہ جلال الدین کو اپنے گھر میں رکھتا اور کرتے پر مکان لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ”بہرحال“ طاہر بیگ بولا۔ یہ فلیٹ یہیں قریب ہے۔ بس کوئی ایک پون فرلانگ کا فاصلہ ہو گا۔ دوسری منزل ہے، دو کمرے ہیں، کچھ ہے، باخھ ہے۔ بھلی، پانی، گیس سب کچھ ہے۔ تم جب تک یہاں کوئی ملازمت یا کار و بار شروع نہیں کرتے، یوں سمجھو کر یہ کرتے کامکان میرا مکان ہے۔ یعنی تمہارا مکان ہے“

کھانے کے بعد طاہر بیگ نے ملازم سے صندوقچہ اٹھوا�ا اور تینوں کو ان کا نیا گھر کھانے لے چلا۔ یہ تھا تو ایک معمولی سافلیٹ مگر طاہر بیگ کی محبت نے اسے چکنادیا تھا۔ تین نتے بلنگوں پر نتے بستر لگے تھے۔ غسل خانے میں تو یہ صابن یک موجود تھا۔ کچھ میں تمام ضروری برتن بجھے تھے اور سوئی گیس کا نیا چولہا جیسے نتے ماکوں کی خاطر بنا ٹھنا بیٹھا تھا۔ جلال الدین فی یہ سب کچھ دیکھا تو ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں ڈبڈ بآئیں اور وہ تشكیر کا کوئی لفظ کرنے لگا تو اس کا گلہ رنده گیا۔ طاہر بیگ نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر سب کو آرام کرنے کو کہا اور تاکید کی کہ پانچ چھ بجے وہ اس کے ہاں آگر چائے پیں اور پھر رات کا کھانا کھایں۔ جب تک ملازم تمہارے گھر کے لئے ایک مہینے کا سودا سلف بھی لے آئے گا اور میرا سارا گھر کل کا کھانا تمہارے ہاں کھائے گا۔ کیوں نزہت میٹی؟“

”جی بسم اللہ“ نزہت خوش ہو کر بولی۔

ظاہر بیگ کے جانے کے بعد نینوں اپنے اپنے پنگوں پر جیسے بت بنے بیٹھے رہے۔ پھر جلال الدین نے اپنی آنکھیں پوچھیں اور پنگ پر دراز ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، حالات نے ہمیں بوٹ لیا مگر ظاہر نے پورے پاکستان کی نمائندگی کر دی ہے۔ اس کے بتاؤ نے میرے توسب زخم مندل کر دیتے ہیں۔“

”سب زخم آباجان؟“ نزہت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ پھر آنسو اس کی آنکھوں سے چھپا کر اس کے چہرے پر دوڑنے لگے۔ ”سب کے سب زخم مندل ہو گئے آپ کے؟ کوئی ایک بھی نہیں بچا؟“ رونے پر ضبط کرنے کی خاطر اس نے پنچھے ہونٹ کو دانتوں میں دبایا۔ اس نے پرس کھولा، اشرف کی تصویر نکالی اور جلال الدین کو دکھاتے ہوتے بولی۔ ”یہ زخم بھی آباجان؟“

”نزہت بیٹی!“ جلال الدین تڑپ کر اٹھا۔ عابدہ بیگم بھی نزہت کی طرف بڑھی۔ ”اب اپنے آپ کو سنجاہا لو میری بچتی؟“ اس نے نزہت کو لپٹایا۔ پھر دلوں نزہت کے دامیں بامیں بیٹھ گئے۔ وہ اس کے سراور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔ وہ جانتے تھے کہ نزہت کے زخم کا انداز مشکل ہے۔ خاصے و قفر کے بعد عابدہ بیگم کو گفتگو کا ایک موضوع سوچا۔ وہ ان غیر ملکی ایکر ہو سٹشوں کی باتیں کرنے لگیں جو اشرف کی تصویر لے گئی تھیں اور جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈھاکے کی ہر فلات پر اشرف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی۔ ”آپ تو میری والی تصویر بھی انہیں دینے لگی تھیں؟“ نزہت نے طنز آکھا۔ ”اگر آپ دے ڈائیں۔۔۔ اگر آپ مجھ سے یہ تصویر چھپیں لیتیں تو پتہ ہے کیا ہوتا؟ میرے لئے اشرف سچ پچ مر جاتا۔“

نزہت اب کے تو بالکل ٹوٹ کر رو دی۔ بہت دیر تک جلال الدین اور

عبدہ بیگ اسے بھلانے کی کوشش کرتے رہے اور اس کو شمش میں خود بھی روتے رہے۔

پھر جب تینوں طاہر بیگ کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتے اور نزہت نے پرس اٹھایا تو عبدہ بیگ نے اسے ڈوکا۔ چار قدم پر تو جانا ہے بیٹی، اور تم پرس لئے آ رہی ہو۔ کچھ عجیب سالگرہ ہے۔ پرس کو صندوق پتے میں رکھ دو اور صندوق پتے کا تالا آتاری لاؤ۔ باہر کے دروازے میں لگائیں گے۔“

نزہت نے ایک پل سوچا۔ پھر بولی۔ “جی اچھا۔ پڑ کر پرس صندوق پتے میں رکھا اور صندوق پتے کا تالا کھوں کر دروازے تک آئی۔ تالا لگاتے ہوئے اس کا ٹاٹھڑک گیا۔ ”امی؟ وہ بولی۔ ”پرس تو چلو نہیں لاتی۔ سچ مجھ اچھا نہیں لگتا۔ پر آپ کیمں تو تصویر نکال لاؤں؟“

”تو تو بیٹی کچھ سچھ پاگل ہو رہی ہے میری طرح۔“ جلال الدین نے اسے پیارے دانسٹا۔ اس کے ہاتھ سے تالا کے کر دروازے میں لگایا، چابی جیب میں ڈالی اور تینوں طاہر بیگ کے مکان کی طرف چل پڑے۔

چاتے اور پھر کھانے کی میز پر خوب مزے مزے کی باتیں ہوتیں رہیں۔ طاہر بیگ نے اپنی بیوی بیٹیوں کو سمجھا دیا تھا کہ ڈھاکے کا کوئی ذکر نہ آنے پاتے۔ وہ اپنے شر کی بھیر بھاڑ اور گھاگھری کی باتیں کرتا رہا اور طاہر بیگ کی اس بات نے تو نزہت یہک کو ہنسا دیا کہ جب پہلی بار اس شر میں آنے والے ایک صاحب رہیوں سے ٹیکش سے نکلے اور شر میں داخل ہوتے تو انسانوں اور مردیفک کے انبوہ کثیر کو دیکھ کر اپنے میزبان سے نہایت معصومیت کے ساتھ پوچھا۔ کیوں صاحب یہ شر خالی کیوں ہو رہا ہے؟“

ملازم شام ہی کو جلال الدین کے گھر کے لئے ہمینے بھر کا سودا سلف خرید لایا

تحا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کو دیں چھوڑ کر طاہر بیگ نے جلال الدین اور ملازم کو ساتھ لیا اور سامان پہنچانے فلیٹ کی طرف چلا۔

فلیٹ میں روشی ہو رہی تھی۔ جلال پہنچنے تو حیران ہوا، مگر پھر یہ توجیہ کر لی کہ عزیزیں گھروں کے معاملے میں بہت محتاط اور دور اندیش ہوتی ہیں اور عابدہ یا نزہت نے تالا رکانے سے پہلے بھلی جلا دی ہو گئی، مگر حب سیڑھیاں چڑھ کر جلال الدین تالا کھونے کے لئے جھکتا تو ایک لمحے تک بچھا رہا اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔
”کیا ہوا جلال؟“ طاہر بیگ نے گھبرا کر پوچھا۔

اور جلال الدین نے فرش پر سے تالے کے دو ٹکڑے چن کر سمجھیں پر رکھے اور سمجھی کو بند کر دیا۔ طاہر بیگ دیوانوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر لپکا۔ پنگوں پر سے بسترا غائب تھے۔ کچن میں برتن، چو لمحے سعیت غائب تھے۔ غسل خانے میں تو لیدی تک غائب تھا۔ طاہر بیگ اور جلال الدین جیسے سانٹے میں آکر ایک کرے کے وسط میں گڑ سے گئے تھے۔ ملازم میں بھر کا سودا سلف ایک کونے میں رکھ کر داپس جا چکا تھا۔ پھر طاہر بیگ نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑا اسے محبت سے دبایا اور بولا۔
”تم کیوں اداس ہو جلال؟ چوری تو میری ہوتی ہے۔“

جلال الدین کے اندر تسب تک دکھ کا ایک طوفان جمع ہو چکا تھا۔ اس نے طاہر بیگ کو سینے سے لگایا اور زور زور سے رونے لگا اور طاہر بیگ ابھی جلال الدین سے کچ کر نہیں پایا تھا کہ دروازے پر نزہت نمودار ہوتی۔ وہ وہاں ذرا سار کی اور پھر ایک پنگ کی طرف پکی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ پنگ کے نیچے رکھے ہوتے صندوق تھے پر جھیٹی، اس کا پنی طرف گھسیٹا اور پھر اسے اس دھشت سے کھولا کر ڈھکنا ٹوٹ کر الگ جا گرا۔

تب عابدہ اور طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں بھی ہاتھی ہوتی آنکھیں۔ سب

نہت کی طرف بڑھیں جو صندوق پر کھولنے کے بعد جیسے پتھر بن گئی تھی۔
کھلے صندوق میں میدا کپڑے جوں کے توں رکھے تھے، صرف نہت کا
پرس غائب تھا۔

نہت، خشک دیران آنکھیں خلام میں گاڑے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ ڈھاکے
میں بیٹھی مکتی باہمی والوں کے قدموں کی چاپ سن رہی ہو۔

پھر جلال الدین نے ”بیٹی، بیٹی“ پکارتے ہوتے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر
جھنگھوڑا اور بولا۔ ”پرس میں کیا تھا بیٹی۔ تصویر تھی نا اشرف کی۔ پھر جب خدا کے فضل
سے خود جیتا جائیں اشرف ہمارے پاس سامنے آجائے گا تو۔۔۔“

”آپ کو پتہ نہیں آیا جی“ نہت بہت پراسرار انداز میں، جیسے راز کی کوئی
بات بتاتی ہوئی بولی۔ ”ہم ابھی تک ڈھاکے میں ہیں۔ اور اشرف سچ مجھ مر گیا ہے اور
مارنے والے اس کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

عالال

آماں ابھی وہی بورہی تھیں کہ وہ مٹی کا پسالہ لئے آنکھی۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی مکھن ہی نہیں نکالا گیا تو سی کہاں سے ملے گی، وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ واپس ملی جاتے یا وہیں کھڑی رہے۔

”بیٹھ جاؤ عالان“ آماں نے کہا۔ ”ابھی دیتی ہوں — کیسی ہو؟“

”جی ابھی ہوں“ وہ وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔

کچھ دیر کے بعد آماں بولیں۔ ”اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں۔ بُرا نہ ماننا نیت بُرمی نہ بھی ہو تو نظر لگ جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں نڈکاں نے مجھے مکھن کا پڑا انکلتے دیکھا تھا تو دوسرے دن مرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکلا، اور اس سے اگلے دن چڑیا کے انڈے کے برابر گائے کوتین دن مرچوں کی وحومی دی تو نظر اتری“

عالان گلکی۔ ”نظر تو کبھی کبھی میری بھی لگتی ہے بی بی جی۔ اس سے پہلے آپ کا شیشے کا ایک گلاس توڑ چکی ہوں“

”ہاں ہاں“ آماں کو یاد آگیا۔ ”تم نے کہا۔ ہاتے بی بی جی۔ کیسا صاف شفاف ہے کہ نظر آر پار جاتی ہے اور پھر لوں ہی پڑے پڑے ٹھیکیں سے ٹوٹ گیا۔ میں تو حیران رہ گئی“ پھر انہوں نے عالان کو ڈالا۔ مگر اس ڈالنٹ میں غصہ نہیں تھا۔ ”واب ادھر

پر لی طرف دیکھو۔“

اور وہ مسکراتی ہوتی ایک طرف کو گھوم گئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوپتے کا پوسٹر پر کھینچ کر ماتھے تک لے آئی اور بولی ”بی بی جی، اندر چھوٹے میاں جی تو نہیں ملیتے ہے۔“

”ارمی وہی عارف ہی تو ہے؟“ اماں بولیں۔ ”رات آیا ہے۔“

عالاں اٹھ کر دروازے تک آتی اور بولی ”رد بلا یں، دُور بلا یں،“
”کیسی ہو عالاں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھی اچھی ہوں؟“ وہ بولی۔ پھر اس کے چہرے پر شرارت چمکی۔ پہلے تو میں آپ کو پہچانی ہی نہیں۔ میں سمجھی کوئی بچھہ موچھیں لگاتے بیٹھا ہے۔“
اس پر اماں کو سنبھل چھوٹ گئی۔ ”توہہ ہے؟“ وہ بولیں۔ ”کم بخت ایسی بات کرتی ہے کہ — توہہ سے!“

عالاں دلپیز پر یوں بیٹھ گئی کہ اس کا ایک پاؤں باہر صحن میں تھا اور ایک کمرے کے اندر رہست کے اس اندازے اس کی نیلی تہبینہ کو تان کر اس کی آدھی پنڈلیوں یک اٹھا دیا تھا۔ اس کے میلے پاؤں کے مقابلے میں اس کی پنڈلیوں کا زنگ ستنا مختلف تھا! اور یہ پنڈلیاں کتنی سڑوں تھیں! یونا نیوں نے ویس کے بت کی جو پنڈلیاں بنائی تھیں، وہ کیا عالاں کی پنڈلیاں دیکھ کر بنائی تھیں!

”عارف میاں، پر دیں میں آپ کیا کرتے ہیں؟“ اس نے مجھ سے یوں پوچھا چیسے چوپاں میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ مٹی کے پیالے کو فرش پر ایک انگلی سے سسل گھماتے جا رہی تھی۔

میں نے کہا ”نوکری کرتا ہوں، روپیہ کاما ہوں۔“

”بی بی جی کو کتنا بیخخت ہیں؟“ اس نے مژارت سے مُسکرا کر پوچھا۔

”اے لڑکی!“ آماں نے اسے ڈانٹا۔ اپنی عُمر کے لڑکوں سے یوں باتیں نہیں کرتے۔ اب تو چھوٹی نہیں ہے۔ کیا ابھی تک تجھے کسی نے نہیں بتایا کہ تو طری ہو گئی ہے؟“ دہ دہیز پر بیٹھی بیٹھی آماں کی طرف گھوم گئی۔ اب اس کے دونوں پاؤں صحن میں تھے اور بالوں کا ایک ڈھیر کمرے میں تھا۔ ڈکون بتائے بی بی جی؟“ دہ بولی۔ ”آماں آتا ہوتے تو بتاتے۔ انہیں تو خدا کے پاس جانے کی اتنی جلدی ٹڑپی بھتی کہ میرے سر پر سے اپنا ہاتھ اٹھایا تو یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ کوئی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھے تو چلیں۔“ عالاں کی آواز کو آنسوؤں نے چکو دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”عالاں تمہاری ماں تو کب کی چل بسی۔ کیا باپ بھی چل دیا؟“ اب کے گھوم کر اس نے دونوں پاؤں کمرے میں رکھ دیئے اور بولی۔ ”جی۔ دہ بھی چلا گیا۔ میں لڑکا ہوتی تو شاید مجھے جو ماگا نہ ٹھنا سکھا جاتا پر وہ مجھ سے روٹیاں ہی کپاٹا رہا اور پانی ہی بھروتا رہا۔ اب میں ایک موچی کی بیٹی ہوں پر اپنے جوتے دوسروں سے مرمت کرتی ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟“ آماں بولیں۔ ”تجھے صرف جوتے گا نہ ٹھنا نہیں آتے نا۔ باقی تو سب کام آتے ہیں۔ اپنی محنت سے کماتی اور کھاتی ہو۔ سارا گاؤں تمہاری تعریف کرتا ہے۔—لوستی لے لو۔“

عالاں جو آماں کی گفتگو کے دوران انہی کی طرف گھوم گئی تھی، اٹھی اور جا کر پایہ آماں کے پاس رکھ دیا۔

دہ لستی کا پایالم لے کر حاملے لگی مگر چند قدموں کے بعد ایک دم رُک گئی اور بلپٹ کر بولی۔ ”آج بھی چکی پیسے آجباڑیں بی بی جی؟“

”آجانا، آجانا!“ آماں بولیں۔ ”آماں تو ڈھیروں ٹپا ہے پر عارف کے آباکی برسی

بھی تو زیادہ دُور نہیں ہے۔ کئی بوریوں کی ضرورت پڑے گی۔ آجانا!“

”جی اچھا۔“ وہ بولی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا۔ ”عارف میاں آپ
کتنی چھٹی پر آئے ہیں؟“
میں نے کہا: ”میں آباکی برسی کر کے جاؤں گا۔“
بولی۔ ”بھر تو بہت دن ہیں۔“

میں جب گاؤں میں ادھر ادھر گھوم کر واپس آیا تو وہ اندر ایک کوٹھریا میں
بیٹھی چکی پس رہی تھی۔ اور وہنی اس کے سر سے اُتر کی تھی اور کھلے بال چکنی کے ہر جگہ پر کے
سا تھا اس کے چہرے کو چھپا اور کھول رہے تھے۔ اس نے ایک ٹانگ کو پورا چھیلا
رکھا تھا اور نیلا تہبند اس کے گھٹنون تک کھینچ گیا تھا۔ اگر ایسی پنڈلی کو کاٹ کر اور
شیشے کے مرتبان میں رکھ کر درائینگ رُوم میں سجادا دیا جائے تو گیسار ہے!
میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ آماں کیسی نظر نہ آیں تو میں پنجوں کے بن کوٹھریا کے
دروازے تک گیا۔ دروازے سے آتی ہوتی روشنی ایک دم کم ہوتی تو اس نے چونک
کر دیکھا۔ چکنی روک لی۔ بالوں کو جھٹک کر سمجھا اور اور وہنی کو سر پر کھینچ لیا مگر چھیلی ہوتی
ٹانگ کو پھیلا رہنے دیا۔ پھر وہ چکنی کی ہتھی کو تھام کر اسے آہستہ آہستہ گھمانے لگی اور
بیری طرف دیکھتی چلی گئی۔

اس وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ ایک موچی کی بیٹی کی آنکھوں کو اتنا بڑا نہیں ہوتا
چاہیتے۔ غریب غریب کو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہی کفايت کر جاتی ہیں۔

اس کے چہرے پر شرارت تھی اور اس ڈر کے مارے کے دوہ کوئی نقرہ نہ مار
دے، میں نے پوچھا۔ ”آماں کہاں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”تو کیا آپ بی بی جی کو دیکھنے یہاں تک آتے تھے؟“

”تو کیا تمیں دیکھنے آیا تھا؟“ مجھے حملے کا موقع مل گیا۔

اس نے بس آتنا کیا کہ ٹانگ سمیٹی اور پھر چلیا دی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے پھر لوچھا۔ ”آماں کہاں ہیں؟“

”یہیں حوالی میں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے چچا کی بیٹی بیمار ہیں۔ انہیں دیکھنے لگتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ جو تم پساتی کر رہی ہو، اس کی کتنی اجرت لوگی ہے؟“

”دو دن کا آٹا توں ہی جلتے گا۔“ اس کے لہجے میں کاٹ سی تھی۔ نہ جانے طنز کر رہی تھی یا اس کا الجھہ ہی ایسا تھا۔

”اچھا دو دن گزر گئے تو پھر کیا کرو گی؟“

”وپھر آجاؤں گی آٹا میئے یا پانی بھرنے یا چھتیں لیپنے!“

”چھتیں لیپنے ہو کیا تم میں چھتیں لیپنا بھی آتا ہے؟“ میں نے سچ مجھ حیرت سے پوچھا۔ اور وہ بولی۔ ”مجھے کیا نہیں آتا عارف میاں۔ بس ایک جو تے گانٹھنے نہیں آتے۔ اور بہت کچھ آتا ہے۔“

”مشلاً اور کیا کیا آتا ہے؟“ میں نے مثارت سے پوچھا۔

”اور۔۔۔؟ اور۔۔۔؟“ وہ کچھ بنانے لگی تھی مگر جیسے سوچ میں پڑگئی اور آخر بولی۔ ”سبھی کچھ آتا ہے آپ دیکھو میں گے ہو لے ہو لے۔“ چند لمحے وہ یوں چکی چلانے میں مصروف رہی جیسے مجھے بھوول گئی ہے۔ پھر حکی روکی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور دوڑانے کی طرف بڑھی۔ میں ایک طرف ہٹا تو دہ باہر آگئی اور بولی۔ ”پیاس لگی ہے پربی بی جی کا کٹورا جھوٹا ہو جائے گا۔ مجھے مبک میں پلا دیجئے۔“

”تم کٹورے ہی میں پی لو۔“ میں نے کہا اور پھر ڈانٹ کے لہجے میں کہا۔ ”چلو، اٹھاؤ کٹورا۔ پیو پانی۔“

اس کی مسکراہٹ کتنی گلابی تھی۔ زندگی میں ہمیں بار انکشاف ہوا کہ مسکراہٹ

کا بھی رنگ ہوتا ہے۔

وہ پانی پی چکی تو کٹورے کو کھنگانے کے لئے اس میں ذرا سا پانی ڈالا۔ میں نے کہا ”بھر دو کٹورا۔“ وہ سمجھی شایدیں کٹورے کو پوری طرح پاک کرنا چاہتا ہوں۔ کٹورا بھر گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے کٹورا اس کے ہاتھ سے اچک کر منہ سے لگایا۔ ”عارف میاں جی!“ وہ انتہائی حیرت اور صدمے سے بولی۔ ”وہ حواس باختہ سی، میری طرف دیکھتی رہی۔ اور جب میں نے خالی کٹورا والپس کیا تو اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور اس کی آنکھوں میں فی کی ایک چکلی تہ نمودار ہو گئی تھی اور اس نے اور ٹھنی کو یوں کس کے لپیٹ لیا تھا جیسے نماز پڑھنے چلی ہے۔

گاؤں میں جوان لڑکی کا ایک ایک قدم گنا جاتا ہے، ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ بہت سے دوست بیٹھے تھے، لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فلاں، فلاں کے ساتھ ہے۔ فلاں فلاں کے پیچے ہے، فلاں اخواہ ہونے کے انتظار میں ہے۔ فلاں اتنے ہاتھوں سے گزری ہے کہ اس بھری جوانی میں بھی پرانی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا ”ایک لڑکی عالاں بھی تو ہے، نادرے موچی کی بیٹی؟“ اس پر سب ہنسنے لگے یہ ”وہ؟“ انہوں نے کہا ”وہ کسی کام کی نہیں ہے۔ گھر ہر میں کام کرنی پھر رہی ہے۔ روپیہ کمار ہی ہے۔ خوبصورت ہے پر نکتی ہے۔ ایک بار بیگو موچیں نے چھپڑا تو بولی ”میں موچی کی بیٹی ہوں۔ کھاں آتا رہتی ہوں!“ بیگو کو اتنی شرم آئی کہ سیدھا نافی کے پاس گیا اور موچھوں کی نوکیں کٹوادیں!“ سب ہنسنے لگے اور دیر تک ہنسنے رہے۔

میں نے کہا ”اگر وہ اتنی محنتی لڑکی ہے تو اس کی عزت کرنی چاہئے۔“ ایک بولا۔ ”وہ عزت بھی تو نہیں کرنے دیتی!“

اس پر سب کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

دوسرے بولا: ”تمارے ہاں تو وہ بہت کام کاچ کرتی ہے۔ کبھی اس کی عزت کر کے دیکھو۔ کھال آتا رہے گی!“

وہ پھر ہنسنے لگئے اور مجھے ان کی ہنسی میں مشرکیں ہونا پڑا مگر مجھ سے اپنی ہنسی کی آواز پہچانی سی نہیں گئی۔ باکل میں کے غالی کنسترمیں لفکر بنخنے کی آواز!

میں گھر والپس آیا تو وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ چہرہ بالکل تباہ ہوا تھا۔ انکھیں بھی صرف ہو رہی تھیں۔ میں چون کھا اور پوچھا: ”کیا بات ہے عالاں؟ روتنی رہی ہو؟“
وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنسی کے دتفوں میں بولی: ”روئیں میرے دشمن۔ میں کیوں روؤں۔ میں تو مرچیں کوٹتی رہی ہوں عارف میاں!“

”تم مرچیں بھی کوٹ لیتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی ایسا کام بھی ہے جو تمیں کرنا نہ آتا ہو؟ تم اتنے بہت سے کام کیوں کرتی ہو عالاں؟“

وہ بولی: ”روپیہ کارہی ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں روپے والے دو گ غریب لڑکیوں کو خرید لیتے ہیں۔ میرے پاس روپیہ ہو گا تو مجھ پر تظر اٹھانے کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ ہے کسی کی مجال؟“ — پھر وہ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولی: ”میں نے آپ کے کرتے کے لئے ممل خریدی ہے۔ اس پر بیل بوٹے کاڑھ رہی ہوں۔“

”یہ غلط بات ہے۔“ میں نے احتیاج کیا۔ ”تماری محنت کے کامے ہوتے روپے سے غریدا ہو۔ اگر تابعے کاٹے گا۔“

”میں کسی کو تباوں گی تھوڑی“ وہ بولی۔ ”آپ بھی نہ بتائیئے گا۔ پھر نہیں کاٹے گا۔“ وہ لگکی۔ پھر ایک دم گھبرا گئی۔ ہاتے میں مرجاوں، کمیں بی بی جی تو نہیں ہُن رہی ہیں۔“ ”بی بی جی“ کے لفظ پر میرے جسم میں بھی سنسنی دور گئی۔ اندر جھانکا تو صحن خالی تھا۔ پھر ملپٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا۔ اچھی لڑکی ہے۔ پیاری بھی ہے۔ شوخ بھی ہے۔ سب کچھ ہے مگر موچی کی لڑکی ہے اور خاندان کے ذرگ کہہ گئے ہیں کہ بلندی پر کھڑے ہو کر گھرے کھڈے میں نہیں جھانکنا چاہیتے۔ توازن بگڑ جاتا ہے اور آدمی گر جاتا ہے۔

آباکی بر سی کے روز ہمارے ہاں پُرا گاؤں جمع تھا مگر اس ہجوم میں بھی عالاں کی دوڑ بھاگ نہیاں تھی۔ وہ پھر کی کی طرح گھومتی پھر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اگر یہ لڑکی اس ہجوم سے نکل گئی تو بر سی کی ساری تنظیم بگڑ جاتے گی اور ہر طرف لش پڑ جاتے گی۔ وہ بالکل برے کی طرح ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوتی پار ہو جاتی اور ملپٹ کر غڑاپ سے اتنی کے کمرے میں گھس کر کواڑ دھڑ سے بند کر دیتی۔ وہاں سے ہدایات لے کر وہ پھر باہر نکلتی اور پھر سے ہجوم میں بر ما لگا دیتی۔ عشاہر کی اذان تک سارا گاؤں کھانا کھا چکا تھا۔ خالی دیگیں ایک طرف سمیٹ دی گئی تھیں۔ نامی، امیراثی، دھوپی، موچی بھی فارغ کر دیتے گئے تھے۔ دن بھر کے ہنگامے کے بعد ایک بہت بھاری سنما گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ آخری ہجان کو رخصت کر کے جب میں امی کے کمرے میں آیا تو مجھے یقین تھا کہ عالاں نہیں امی کے بازو اور پنڈلیاں دبارہ ہو گی۔ مگر امی تو اکیلی بیٹھی تھیں۔ زندگی میں شاید پہلی بار امی کا لحاظ کئے بغیر میں ان سے پوچھ بیٹھا۔ ”عالاں کہاں ہے؟“

مگر امی اس سوال سے بالکل نہیں چونکیں۔ بولیں۔ ”وہ لڑکی ہیرا ہے۔ بیٹا۔ بالکل ہیرا۔ آج تو وہ میری آنکھیں، میرے بازو، میرا سب کچھ تھی۔ دن بھر کی تھکی ماندی تو تھی، ہی، کھانے بیٹھی تو دوچار نوا لوں کے بعد جی بھر گیا۔ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔ اس دیگھی کو چاولوں سے بھرا اور اسے لے جانے کو کہا تو وہ بولی یہ چاول تو مجھے عارف میاں دیتے ہوتے بھلے لگتے۔ اور وہ کو رخصت کرتے رہے پرانوں نے مجھے تو پوچھا ہی نہیں۔ میں نہیں لے جاتی؟“ اس نے یہ بات ہنسی میں کہی پر اس نے

ٹھیک کا بیٹا۔ اندر کا سارا کام اسی نے سن بھائے رکھا تم سب کو خصت کر رہے تھے اسے بھی خصت کرتے۔ دیسے تو وہ ہنس تی ہنس تی چلی گئی ہے پر اسے ہنسنے کی عادت ہے اور بیٹا، جن لوگوں کو ہنسنے کی عادت ہوتی ہے نا۔ اسیں رونا بھی ہوتا ہے تو ہنسنے لگتے ہیں۔ تب وہ ہنسنے ہیں تو اندر سے رو رہے ہوتے ہیں۔ تم نے ایک موچن سمجھ کر عالاں کی عزت نہ کی، عالانکہ عالاں کا اپنا مان ہے۔ اس کا یہ مان قائم رکھو بیٹا اور چاولوں کی یہ دیگچی اسے دے آؤ۔ تھوڑی دیر پہنچی گئی ہے۔ سوتی نہیں ہو گئی۔ پھر کل صبح صبح تم جا بھی رہے ہو۔ وہ کیا یاد کرے گی تھیں۔ جاؤ۔“

عالاں اپنے گھروندے کے دروازے کے پاس چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔ میں نے پاس جا کر اسے آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس کے قریب کوئی گولا پھٹا ہے۔

”عارف میاں جی!“ وہ بولی۔ پھر حسب عادت ہنس کر کہا۔ ”چاول دینے آئے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ چاول ہی دینے آیا ہوں۔“

”لا یتے؟“ اس نے ہاتھ بڑھائے۔ ”بی بی جی نے بتایا ہو گا، میں نے کیا کہا تھا؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں۔ بتایا ہے؟“ میں نے کہا۔

دیگچی کے کراس نے چارپائی پر رکھ دی اور بولی۔ ”ہاں گھر میں دیتے تو زیادہ اچھا لگتا۔“ دیسے اب بھی اچھا لگ رہا ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ آخر ایک بات سوچی۔ ”میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔“

”وہ بچھے معلوم ہے؟“ عالاں بولی۔

”معلوم تھا تو وہاں گھر میں ذرا سی رُک جاتیں“، میں نے کہا
 وہ بولی۔ ”آپ کے کرتے کا آخری ٹانکا باقی تھا۔ وہ آکے لگایا ہے۔ بکسے
 میں اس کرتے کی جگہ تو ہو گئی نا۔ اور وہاں صبح آپ کا بحاسا اٹھا کر بسوں کے اڈے پر مجھے
 ہی تو آپ کو پہنچانا ہے۔ بی بی جی نے کہا تھا۔“
 میں نے کہا۔ ”تم کیا کچھ کر سکتی ہو عالاں۔ چکی تم پس لیتی ہو۔۔۔ چھتیں تم لی پ
 لیتی ہو۔۔۔ مرچیں تم کوٹ لیتی ہو۔۔۔ کنوٹیں سے دود تین تین گھٹڑے تم پانی بھر لاتی ہو۔۔۔ پوٹے
 گھر کا کام تم سنبھال لیتی ہو۔۔۔ کرتے تم کاڑھ لیتی ہو۔۔۔ تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو عالاں؟“
 وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر دو قدم اٹھا کر میرے اتنے قریب آگئی کہ مجھے اپنی
 گردن پر اس کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ ”میں تو اور بھی ہست کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں“
 اس کی آواز میں جھنکا رہی تھی۔ ”آپ کو کیا معلوم میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں؟“
 ذرا سے دتفے کے بعد وہ بولی۔ ”مجھ سے پوچھتے نا، میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں؟“
 پلی جماعت کے پنج کی طرح میں نے اس سے پوچھا۔ ”اور کیا کچھ کر سکتی ہو؟“
 ”میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں“، اس نے جیسے کائنات کا راز فاش
 کر دیا۔

میلاد پرستھر

اماں نے ہمیں آدمی رات ہی کو جگا دیا۔ اٹھو بیٹو۔ منہ ما تھو دھولو۔ کپڑے بدل لو۔ شیر و مراثی اور نورا سار بان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔

اس وقت چاند سیدھا ہمارے سردن پر چک رہا تھا۔ ہوا اتنی خاموشی سے چل رہی تھی کہ بیری کے صرف سائے میں کہیں کہیں جنبش ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر پتھر ل رہے ہیں۔ پنجھرے میں ستا ہوا طوطا اپنے سر کو ایک طرف کئے پھول ہیں کچھ یوں چیپا نے پڑا تھا جیسے کوئی اس کا سر کاٹ لے گیا ہے۔ بلی روئی کا ایک گالا بنی بیٹھی تھی۔ ”مازو بَا“ میں نے اسے بلا یا تو وہ اٹھی۔ انگڑا اپنی لی تو وہ اپنے قد سے ڈلیوڑھی بھی ہو گئی۔ پھر وہ دیہیں سے کو د کہ میری چارپائی پر آبیٹھی اور خر خر گرتی ہوئی میری گود میں گھنے گئی۔

”تم نے بلی کی عادتیں بچاڑ دی ہیں۔“ اماں جو ہمارے لئے چوری بنانے کی خاطر چو لہا جلا رہی تھیں، بولیں۔ ”اب تمہارے جانے کے بعد یہ دو تین دن تک تو ردتی پھرے گی۔“

بھائی جان نے پوچھا۔ ”اور اماں۔ ہمارے چلنے جانے کے بعد آپ تو نہیں روئیں گی نا؟“

وہ نہیں تو، اماں بولیں، اور پھر روئے لگیں۔

ہم چار پائیوں پر سے کوڈ کر اماں سے پست گئے اور اماں ہم دونوں کے سروں پر راتھ پھیرتے ہوئے روئی رہیں اور کہتی رہیں: "میں کیوں ردوں ہیں میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی ردوں، جب میرے پتھے میرا سما را بننے والے ہیں۔ پھر جب تم دونوں نوکر ہو جاؤ گے نا تو میں اپنی گز دی ہوئی زندگی سے جی بھر کر بدے دوں گی میں نواڑ کے پنگ پر سوؤں گی۔ میں رشیم کی چادر اور ٹھوں گی۔ میں طلبہ گھج جوتے پہنون گی اور تمہاری بیویوں سے اپنے پاؤں دبواؤں گی۔"

"تمہاری بیویاں آج کل کہاں رہتی ہیں اماں؟" میں نے پوچھا۔

اور بھائی جان ہنسنے لگئے۔ پاگل ہے یہ چھو کرا۔ شرم نہیں آتی۔"

اماں بھی ہنسنے لگیں اور مجھے سینے سے بھیخ کر بولیں۔ وہ تمہارے چھاپکی بالا خلنے کی مٹی پر ایک بڑا ستارہ چک رہا ہے۔ اس میں رہتی ہیں۔ یہ ستارہ تھوڑا تھوڑا اہل رہا ہے۔ بتا د کیوں ہل رہا ہے؟"

میں بیری کے ساتے کی ہلکی ہلکی جنبش دیکھ رہا تھا، فوراً بولا۔ "ہوا سے ہل رہا ہے؟" اور اماں ہنستی ہوئی بولیں: "نہیں بیٹا۔ ہوا کے کہاں ہل رہا ہے۔ ستارہ اس تھے ہلتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہیں دیکھو دیکھ کر خوس ہو رہی ہیں اور تالیاں بجا بجا کر ہنس رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس بڑھیا کے ٹھاٹھ دیکھو۔ ہم سے پاؤں دبوائے گی! یہ صندھ اور مسور کی دال!"

"یہ کہہ رہی ہیں؟" میں نے بگڑ کر کہا۔ "میں انہیں ماروں گا۔"

اچانک بتی چار پانی سے کوڈ کر پھر سے میری گود میں گھس آتی۔ اماں نے اس کی گردن کا چڑا چٹکلی میں لے کر اُسے اٹھایا اور اسے ایک طرف ڈال کر پانی سے اپنا پوٹا دھوتے ہوتے بولیں۔ اس بے زبان کو تو پتہ چل گیا ہے کہ اٹھر گر میوں کی چھٹیاں

گزار کر واپس کیمبل پور جا رہا ہے۔“

ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتے۔ چوری کھاتی اور نورے کا انتظار کرتے کرتے تھاک گئے تو آماں کے کہنے پر اسے بلا نہ نکلے۔

گاؤں بالکل چپ تھا جیسے سانش روکے پڑا ہے۔ جیسے کہ تک مر گئے تھے۔
”بھائی جان!“ مجھ پر سنائے کا ہول مسلط ہونے لگا۔ چلتے واپس چلیں خود آماں کہتی ہیں کہ
آدھی رات کے بعد گلیوں میں چن گھومتے ہیں۔“
بھائی جان بولے۔ ”آماں یہ بھی تو کہتی ہیں کہ آیتہ الکرسی پڑھنے سے چن بھاگ جاتے
ہیں۔ آیتہ الکرسی پڑھو۔“

میں نے سوچا اگر ایسی بات ہے تو خود بھائی جان آیتہ الکرسی پڑھتے ہوتے آگے
کیوں نہیں پڑھتے جبکہ نورے کا گھر کل دو گلیاں دور ہے۔ مگر میرے پاس زیادہ سوچنے
کا وقت نہیں تھا۔ میں آیتہ الکرسی پڑھنے لگا۔

ابھی میں ”ڈالا نوم“ تک ہی پہنچا تھا کہ گلی کے پرے سرے پر ایک جن نمودار
ہوا۔ ”بھائی جان!“ میں نے چینخے کی حد تک سرگوشی کی اور بھائی جان سے پست گیا۔
”آیتہ الکرسی پڑھو۔“ انہوں نے بھی چینخ کی حد تک سرگوشی کی اور اپنے آپ کو میری
گرفت سے آزاد کیا۔ آماں کہتی ہیں کہ جن سے ڈر کر بھاگنے سے آدمی مر جاتا ہے۔ پھر
جن ان بچوں کو تو کچھ نہیں کہتے جو آیتہ الکرسی پڑھتے ہیں۔“

گلی کے پھر لڑھاک اور نج رہے تھے اور اب جن ہم سے کوئی دس گز دور رہ
گیا تھا۔ پھر وہ وہیں رُک گیا اور بولا۔ ”کون ہوتا ہے جن ہو ہے بھوت ہو ہے کون ہے بلو ہو رہے پھر
مارتا ہوں۔“ اور اس نے جھاک کر ایک پھر اٹھا بھی لیا۔

بھائی جان فوراً بولے مگر عجیب طرح بولے۔ میں ان کی آواز پہچان ہی نہ سکا۔ ”ہم
اکبر اور اطہر ہیں۔“

”اوے بیڑا تر جاتے تمہارا“ وہ پتھر زمین پر پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ ”میں تو در گیا تھا تم تو میرے سامنے ہو۔ میرا قدم میرے چار طرف دھرن کئے لگا تھا۔ میں بھی کہوں یہ کون ہاتھ پتھر کی چیزیں کھڑی ہیں۔“ اور پھر وہ ہنسا۔

”تم کون ہو؟“ اب کے بھائی جان باقاعدہ کڑکے۔

وہ بولا۔ ”میں تمہارا دھوپی ہوں۔ زمان دھوپی۔ کیا کر رہے ہو یہاں آدمی رات کو؟“ میں پہلی بار بولا۔ ”ہماری جھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہم کہبل پور جا رہے ہیں۔ ہم شیر و مراثی اور نورے سار بان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تم اس وقت کیا کرتے پھرتے ہو؟“ بھائی جان نے زمان سے یہ سوال ایسے رُعب سے پوچھا جیسے اُستاد بچوں سے پوچھتے ہیں۔

زمان بولا۔ ”میں پتھر کلانے جا رہا ہوں۔ روز اس وقت گھر سے نکلا ہوں۔ صبح کی نماز نیلی دصیری پر پڑھتا ہوں۔ پتھروہاں نیلیا پتھر کاٹتا ہوں۔ تمہارے پہچان نیامکان نہ ہوئیں گے نانیے پتھر کا۔“

”کیا دھوپی بھی پتھر کاٹتے ہیں؟“ بھائی جان نے جیران ہو کر پوچھا۔ اور زمان نے جواب دیا۔ ”جب دھوپی کے پاس دھونے کو کچھ نہ ہو تو اسے پتھر بھی کاٹنے چاہیں۔ ورنہ وہ انسانوں کو کاٹنے لگے گا۔“ وہ ذرا سار کام مگر ہمیں خاموش پا کر ہنس دیا۔ پتھر بولا۔ ”کیا کر دوں۔ چھ پنچے ہیں۔ نہ ان کی ماں ہے نہ دادی۔ سب مجھ میں گھسے چلے آتے ہیں تی کے بچوں کی طرح۔ سب کا دوزخ بھرنا ہوتا ہے اور خدا میرا سہارا ہے اور میں اُن کا سہارا ہوں۔“

سہارا بیم نے سوچا۔ یہ سہارا کیا ہوتا ہے؟ ابھی ابھی آماں بھی کہہ رہی تھیں کہ تم میرا سہارا ہو۔ اب یہ زمان دھوپی بھی کہہ رہا ہے کہ خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بال بچوں کا سہارا ہے۔ آخر کیا ہوتا ہے یہ سہارا۔ ”کیوں بھائی جان؟“ یہ

سہارا کیا ہوتا ہے؟“

مگر جانی جان نے تو میری بات سنی ہی نہیں۔ تالی بجادی: “آگیا نورا!“ انہوں نے نعرہ مارا۔

”اب نیلی ڈھیری پر ملاقات ہو گی۔“ زمان دھوبی بولا۔ ”خوشاب کا راستہ وہیں سے گزرتا ہے نا۔ میں تمیں ایک نیلا پتھر دوں گا جو میں نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں گھری نیلی لہری ہیں اور نیلی نیلی چڑیاں سی اڑرہی ہیں اور نیلے نیلے پھول سے کھل رہے ہیں۔ قدرت بھی عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ میں تو دو پر کو بھی وہ پتھر دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھنے لگوں لے جانا اپنے ساتھ۔ اپنے چاچا جی کو دینا۔ کتنا زمان دھوبی نے بھیجا ہے۔ وہ خوش ہوں گے۔ خدا کے بعد ہم غریبوں کا وہی تو سہارا ہیں۔“

”سہارا!“ میں باقاعدہ چونک پڑا۔ مگر زمان آگے بڑھ گیا تھا۔

دُور سے اونٹ کتنا بہت سالمبا لگ رہا تھا۔ اس کی گردن میں لکھی ہوتی لکھنٹی یہی نج رہی تھی جیسے کوئی لڑکی گاہری ہے۔ تب ایک مرغ نے بانگ دے ڈالی۔ پتھر تو بانگوں کا تانتا بندھ گیا۔ قادرے کے باڑے میں ایک بکری میانی اور فوراً بعد اس کا کتا بھونکا۔ کاؤں نے انگڑائی تی لی جیسے ہمیں رخصت کرنے کے لئے اٹھ بیٹھا ہے۔ میں اندر بھاگا۔ پتھر شیر و دروازے پر سے پکارا۔ ”بی بی جی، پرده۔“ میں اندر آکر بچوں کا صندوق اٹھا لوں۔“

”دو صندوق ہیں۔“ میں نے شیرو کو ڈالنا۔

”اہاہا!“ شیرو نے میری بغلوں میں ہاتھ رکھ کر مجھے پکڑا اور اپنے ٹمر سے بھی اونچا لے گیا۔ اب تو میرا چھوٹا سا میں بھی صندوق والا ہو گیا۔ تمہاری موچپیں کب نکلیں گی۔ جلدی جلدی سے بڑے ہو جاؤ نا۔ پتھر میں تمہاری شادی پر ایسا ایسا ڈھول بجاوں گا کہ تان سین نے بھی ایسا ڈھول نہ بجا یا ہو گا۔ تمی تو مجھ غریب کا سہارا ہو۔“

پھر وہی سہارا! یہ سہارے کیا ہوتے ہیں آخر میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ اس نے صندوق اٹھا کر کندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ اندر کوٹھے میں امی ہمیں پیٹکتے کھڑی رہیں اور کچھ پڑھتی رہیں اور ہم پر چھوہ چھوہ کرتی رہیں اور روئی رہیں۔ پھر شیر و دوسرا صندوق بھی لے گیا اور جاتے ہوئے کہا گیا۔ ”چلو جی؟“

جب ہم کجاوے میں بیٹھے تو جب بھی ڈیورٹھی کے دد داڑے کے پیچھے سے امی کی روئی آواز آرہی تھی۔ ”اللہ انہیں خیر خیریت سے پہنچانا۔ اللہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اللہ تیرے بعد یہی تو میرے سہارے ہیں۔“

سہارے! — میں بھائی جان سے ضرور پوچھتا مگر ہم دونوں کے درمیانِ اُنٹ کا کوہاں حائل تھا، اور پھر مجھے ایک دم بہت سارو ناجی تو آگیا تھا۔ اونٹ گلی کا موڑ مڑا تو میں غبیط نہ کر سکا۔ میں نے چینخ ماری۔ ”امی جی!“ — اور بھائی جان کجاوے میں گھٹنوں کے بل اُٹھے اور مجھے ڈاٹا۔ ”دیکھتے نہیں ہو ساتھ شیر و اور فوراً آرہے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے کہ ہم اتنے بزدل ہیں۔ پوچھ کر آنکھیں۔ چپ ہو جاؤ۔ آیتِ الکرسی پڑھو!“ مجھے بھائی جان کی آواز بھی بھیگی بھیگی گلگی۔ میں نے کہا۔ ”آپ بھی آنکھیں پوچھ لیں اور آیتِ الکرسی پڑھیں!“

اور وہ بیسے مان گئے۔ ”اچھا!“

پھر میں نے کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کہا۔ ”بھائی جان۔ جب زمانِ دھوپی اپنے پکوں کو گھر میں چھوڑ کر نیلی ڈھیری پر جاتا ہو گا تو ہماری طرح روتا ہو گا۔“ ”کیوں؟ وہ کیوں روتے؟“ بھائی جان نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ہم اپنی امی کے سہارے ہیں۔ وہ اپنے پکوں کا سہارا ہے۔ ہم رُد رہے ہیں تو وہ کیوں نہیں روتا؟“ میں سہارے کو فقرے میں استعمال کر کے بہت خوش ہو رہا تھا۔

”چپ رہو۔“ بھائی جان بولے۔ ”یہ تم آئیتہ الکرسی پڑھ رہے ہو؟“
کاؤں سے باہر جب اونٹ کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا تو نور سے نے
اسے روک لیا۔ پھر شیرود نے کجاوے کے قریب آگر کہا۔ ”لو جی اب میں واپس چلوں
پتھے جائیں تو مجھے کھاث پر نہ پا کر ردمیں گے۔“

”تم اپنے بچوں کے سارے ہونا چاچا شیرد؟“ میں نے سارے کا ایک اور
نفرہ گھٹرا، اور شیرود نے فورے سے کہا۔ ”دیکھنا فورے۔ کسی چٹاک پٹاک باتیں کرنے
لگا ہے میرا چھوٹا سائیں۔“ پھر اس نے اپنا ہاتھ اور پر کجاوے کی طرف بڑھایا۔ میں نے
کجاوے میں سے اپنا ہاتھ لٹکا کر مصافحہ کیا تو وہ میرے ہاتھ کو ہولے ہولے ہلاہلا کر
کہنے لگا۔ ” وعدہ کرو جی کہ اس ایک سال میں تم ایک دم دس سال بڑے ہو جاؤ گے۔
کیس میں تماری جوانی کی راہ نکتے نکتے کھاک ہی نہ جاؤں اور کیسی یہ حسرت ڈل
ہی میں نہ لے جاؤں کہ میاں اکبر اور میاں اطہر کی شادی پر میں دوسروپے کماوں گا
اور اپنی ماں کے دانت لگواؤں گا۔ لکھ لو کسی کتاب میں۔ دوسو سے کم ایک پسی نہیں
لوں گا۔ تم کم دو گے تو روٹھ جاؤں گا۔ میری ماں بیچاری تو اسی سارے اپنے پوپے
منہ سے پٹانے چھوڑتی رہتی ہے۔“

شیرود اور نورا ہنسے۔ پھر شیرود نے دوسرے کجاوے میں بھائی جان سے
ہاتھ ملایا۔ اس نے بھائی جان سے بھی کچھ ایسی باتیں کی ہوں گی مگر میں نے سنی نہیں۔
اب اونٹ چلنے لگا تھا اور میں اونٹ کی گھنٹی کی ایک ہی رٹ سن رہا تھا۔ رہ کہہ
رہی تھی۔ — سارے ہی سارے۔ سارے ہی سارے۔ سارے ہی سارے۔
پھر کیا کیا یوں ہوا جیسے کسی نے چار طرف آسمان کے کنارے کے ساتھ چوربی
گھماوی ہے۔ آس پاس کی جھاڑیوں پر کیس سے اتنی بست سی چڑیاں آگئیں کہ اونٹ
کی گھنٹی کی رٹ دب گئی۔

”یہ تو آپس میں مظر ہی ہیں“ میں نے بھائی جان سے کہا۔

اور اونٹ کی مہار تھام کر ہمارے آگے آگے چلتا ہوا فراہمن کر بولا۔ ”مینیں میاں۔ لڑکاں رہی ہیں۔ دن بھر پیس چین کرنی ہے۔ اس لئے گلے صاف کر رہی ہیں۔“ اس پر بھائی جان یوں ہنسے جیسے پکے فرش پر بلوک کے بہت سے لعل گرپڑیں۔ پھر وہ بولے۔ ”چاچا نورے“

نورا پلٹے بغیر بولا۔ ”جی میاں“

بھائی جان نے کہا۔ ”کوئی کہانی سنا۔ جیسے پچھلے سال سنائی تھی۔“

نورے نے پوچھا۔ ”وہی گیدڑ والی جوتتے توے پر بیٹھ گیا تھا اور جب گھر کر بھاگا تھا تو اس کے ساتھ توآ بھی چٹا چلا گیا تھا۔“

ہم دونوں نے جیسے پوری کہانی سن لی! ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

”چلو دہی سناؤ“ میں نے کہا۔ ”بھائی جان کو یاد ہو گی۔ مجھے تو یاد نہیں۔“

”مجھے تو یاد ہے“ بھائی جان بولے۔ ”پرمزیدار ہے۔ پھر سن لیں گے۔“

”تو لو سنو“ نورا بولا۔ ”ایک تھا گیدڑ۔ چورا چکا قشم کا گیدڑ۔ ایک غریب بڑھیا کے توے پر سے روٹیاں اٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ ایک دن۔“

اچانک بھائی جان بولے۔ ”ہم نیلی ڈھیری پر کس وقت پہنچیں گے چاچا نورے؟“

”نیلی ڈھیری پر“ نورے نے جیسے سوچا۔ ”جب سورج پورا اطباق سا نکل آئے گانا، اس وقت ہم نیلی ڈھیری پر ہوں گے۔“

”اس وقت تک زمان دھوپی کتنا نیلا پتھر کاٹ چکا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے!“ نورے نے چلتے چلتے پہلی بار پٹ کر دیکھا۔ ”میاں تمہیں کس

لے بنایا کہ زمان پتھر کاٹتا ہے؟“

بھائی جان بولے۔ ”ہم تھاری راہ دیکھ رہے تھے تو گلی میں سے گزرا تھا۔ کہتا

تحا میں نہیں نیلی ڈھیری پر ملوں گا۔”

”اچھا!“ نورا مظہن ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”یہ لوگ جاتے ہی تو پتھر نہیں کامٹنے لگتے۔ اگر کل کا پتھر کھا ہو گا تو اسے کامیں گے۔ درنہ صبح سوریے بارود بھریں گے۔ پھر باڑو کو فلیتہ لگائیں گے۔ زور کا ایک گول چھپوئے گا۔ چنانیں خربوزوں کی طرح چھارٹی چھارٹی ہو جائیں گی۔ تب زمان اور دسرے مزدور ان کو جمع کر کے انہیں ہاتھ ہاتھ بھر کے پتھروں میں کامیں گے۔“

”ارے، اتنی محنت کرنی پڑتی ہے!“ بھائی جان بولے۔

”ہاں جی!“ نورے نے تائید کی۔ ”خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ٹپیوں کے اندر کا گودا خشک کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر بال بچوں کے لئے ایک روٹی کمائی جاتی ہے۔“

بھائی جان کو صدمہ سا پہنچا۔ بولے ”تو پھر ہمارے چھا جان انیٹوں کا مکان کیوں نہیں بنوا لیتے؟“

”ارے نہیں میاں!“ نورا ہنسا۔ ”نیلے پتھر کے مکان کی تو شان ہی اور ہے۔ اکبر بادشاہ نیلے پتھر ہی کے محل میں رہتا تھا۔ نیلے پتھر کو بس دو ہائیجھو۔ مستری جب انہیں سنوارتے اور برادر کرتے ہیں تو ایک ایک پتھر ایک ایک دن لیتا ہے۔“

”اچھا!“ — ”ہاں جی!“

سُورج کا ماتھا مشرق میں چمکا تو نیلی ڈھیری کی طرف ایک دم بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور آس پاس کی پہاڑیاں دیر تک بختی رہیں۔ ”یہ نومیاں!“ نورا بولا۔ ”بارود سے چان چھارڈی۔ اب جب ہم نیلی ڈھیری پر ہنچیں گے تو زمان اور دسرے لوگ پتھر کاٹ رہے ہوں گے۔“ ہم نیلی ڈھیری پر پہنچنے تو دو آدمی بھاگتے ہوتے ہمارے پاس سے گزرے۔ نورے نے انہیں ٹوکا۔ ”کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

”خیر کہاں بھائی؟“ ان میں سے ایک بولا۔ ”کسی سے غلطی ہو گئی۔ ابھی لوگ ٹھیک طرح سے چھپنے بھی نہ پاتے تھے کہ دھماکہ ہو گیا اور چنان کے ٹکڑوں نے مزدوروں کو ادھیر کر چینک دیا۔ کتنے ہی لوگ اموامان ہو رہے ہیں۔ ہم گاؤں سے آدمی لینے جا رہے ہیں اسی انہیں اٹھو اکر قصہ کے ہسپتال میں پہنچانے کے لئے۔“

”زمان تو ٹھیک ہے نا؟“ میں کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر پکارا۔

”زمان؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بھتی۔ اپنا زمان دھوپی؟“ فوراً بولا۔

”اچھا ہاں۔ وہ دھوپی!“ وہ شخص بولا۔ ”میں پتھر کی کرچوں سے اس بے چارے کی تو انکھوں کی پلیاں ہی لٹڑ گئی ہیں۔ کاشم کی سی تو ہوتی ہے آدمی کی آنکھ۔“
بھائی جان جیسے فریاد کرتے ہوئے بولے۔ ”مگر زمان تو کہتا تھا، خدا اس کا سہارا ہے اور وہ پتنے بچوں کا سہارا ہے!“

وہ شخص جلدی میں تھا۔ جاتے ہوئے بولا۔ ”اس بے چارے نے تو بس ایک ہی رٹ لگا کر کھی ہے۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا؟“
کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ — اونٹ کی گردن میں بھتی ہوتی گھٹٹو
کے اس سوال نے پوری نیلی ڈھیری کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا اور اس پاس کی ڈھیریاں اس گونج کی جھوپیاں بھر کر جیسے اُد پر آسمان کی طرف اچھال رہی تھیں۔

بارٹر

رخشی نے سگریٹ کا کش لگا کر سر پچھے بچینکا اور دھوئیں کو ایک مینار کی صورت میں چھت کی طرف اڑاتے ہوئے بولی: "ایک بات کہوں مودی؟ پر ایک شرط ہے۔ تم خفائنیں ہو گے؟"

محمود کا یہ پانچواں پیگ تھا۔ پانچویں پیگ کے ساتھ ہی وہ بظاہرا پنے وجود میں سے نکل بھاگتا تھا اور اس کا ثبوت یوں دیتا تھا کہ گفتگو کے دوران میں ایک آدھ جملہ ترجم میں ادا کرتا تھا۔ وہ بولا: "بول رخشی ڈارنگ!" پھر وہ تنگنا پا۔ "بول کیا بولتی ہے؟" رخشی نے ایک اور کش لگایا اور دھوئیں کو دھارے کی صورت میں سیدھا محمود کے کھلے منہ میں چھپوڑ دیا۔ محمود زور سے ہنسا اور بولا: "وکی ہو ڈارنگ! کیمیں تمہارے سگریٹ بجھ تو نہیں گیا ہے۔ اس کا دھواں تو بہت ٹھنڈا ہے، جیسے تمہارے گرم گرم پھیپھڑوں کے بجا تے کلب کے اتیرکند ڈلیشن میں سے نکلا ہے۔"

رخشی ہنسی اور کلب میں بیٹھے ہوئے سب خواتین و حضرات نے ایک ساتھ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

دراصل رخشی بہت محبتی تھی مگر جب وہ ہنستی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سی کوئی ایک ساتھ بولنے لگی ہیں۔ عورتیں اس کی ہنسی کی نقل کرتی

تھیں۔ مرد جب سرور میں آتے تھے تو اس سے ذرا سا ہنسنے کی لیوں فرمائش کرتے تھے جیسے وہ ہنسنے نہیں ہے، غول گاتی ہے۔ رخصی کو اپنی ہنسی کی قیمت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ اسے بہت کم خرچ کرتی تھی۔ وہ ہنسنے کے معاملے میں بہت تبدیل سے کام لیتی تھی۔ جب ساری محفل قہقہے لگا رہی ہوتی تھی تو وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتی تھی۔ وہ اپنی ہنسی کو اس بحوم میں گنوانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے جب وہ ہنسنی تھی تو صرف وہی ہنسنی تھی۔

رخصی کی ہنسی نے جیسے جال پھینک کر پورے کلب کی چھلیاں سمیٹ لیں۔ ”بھئی صد ہے!“ رخصی کی ہنسی پر نگینہ تک چونک پڑی۔ نگینہ اور اس کا شوہر مختار آج پام گرد و کلب میں اپنے دوستوں کے مہان تھے اور نگینہ ان میں گھری ہوئی کہہ رہی تھی: ”اگر میری ہنسی اتنی سُری ہوتی تو پتہ ہے میں کیا کرتی؟“ میں ہنسنے ہنسنے مر جاتی؟“

اس پر مختار کے دوستوں نے نگینہ کو بڑی تشوش سے دیکھا اور مختار بولا۔ ”تم اگر ہنسنے ہنسنے مر جاتیں، تو پتہ ہے میں کیا کرتا؟ میں روٹے روٹے مر جاتا۔“ ”تو کیا آج کل تم اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے ہو؟“ نگینہ نے پوچھا اور سب مردوں نے ہنسنے ہنسنے میز پر ہاتھ بلکہ مردے مارے۔

”یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟“ رخصی نے محمود سے پوچھا۔

محمود بولا۔ ”اس وقت نگینہ کے گرد مختار سمیٹ چار پانچ مرد جمع ہیں اور جب ایک خوبصورت عورت کے پاس اس کے شوہر کے علاوہ ایک سے زیادہ مرد جمع ہوں تو وہ ایک دوسرے کے ڈر کے مارے۔“ اور اب محمود لگانے لگا۔ ”ایک دوسرے کے ڈر کے مارے باتیں کم کرتے ہیں اور ہنسنے زیادہ ہیں۔“ رخصی اس بات پر تالی بجا کر اتنی ہنسی کر دہ دوہری ہو گئی۔

اور سارا لکب حیران رہ گیا کہ رخشی نے دو ہی منٹ بعد دوبارہ ہنسنے کی عیاشی کیسے کر لی۔

مگر رخشی آج اسراف پر بھُور تھی۔ اسے آج محمود سے ایک کام تھا۔ ”تو پھر کہوں مودی؟“ اس نے پوچھا۔

مودنے ترمیں جواب دیا۔ ”کہو نہیں ڈارنگ۔ حکم دو۔ آرڈیننس جاری کرو۔“ رخشی بڑی آسودگی سے مسکراتی اور میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر بولی۔ ”آج کل مختار مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔“

مودنے ایک دم پیگ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا اور پرلی طرف بیٹھے ہوتے مختار کی طرف گھوڑ نے لگا۔ پھر وہ سکی کی بوتل کو گردن سے پکڑ کر بولا۔ ”کہو تو جا کر یہ بوتل اس کے سر پر توڑ دوں۔“

”نهیں یہ بات نہیں ہے مودی۔“ رخشی کے لمحے میں پوچھا رہی تھی۔ ”تم سنو تو مگر پہنچ دعہ خفا تو نہیں ہو گے نا؟“

”یہ خفا خفا کی کیا رٹ لگا کر کھی ہے رخشی؟“ محمود خفا ہونے لگا۔ ”تم سے خفا ہو کر کیا مجھے اپنا ہارت فیل کرانا ہے؟ بولو۔ جلدی سے بولو۔“

رخشی نے اپنی لمبی سڈول گردن آگے بڑھائی۔ ”سنو کل مختار نے مجھے زبردستی کرنے کی کوشش کی۔“

مود کا ہاتھ بوتل کی گردن کی طرف بڑھا۔ مگر رخشی نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”تم سنتے تو ہو نہیں۔ میں چاہتی ہوں ذرا دیکھیں مختار کتنے پانی میں ہے؟“ پھر اس نے سرگوشی کی۔ ”میں کل دو چار گھنٹے اس کے ساتھ شاہ بلوط ہو ٹوں میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں صرف ٹوہ لگانا چاہتی ہوں کہ نگینہ سے شادی کرنے کے بعد بھی وہ۔——“

”ہاں ہاں!“ محمود کو بھی کرید ہوئی۔ ”اگر مختار نگینہ کی سی شہزادی سے شادی کر کے بھی۔۔۔“

”شہزادی ہے؟“ رخشی نے بھڑک کر محمود کی بات کاٹی۔ ”شہزادی کیسے؟“
”محمود ہنسا۔“ اری نہیں ڈار لٹک اسپ اسے شہزادی کہتے ہیں نا۔ دراصل اس کی چال ڈھال میں جو دبدبہ ہے، اس کے ناک نقشے میں جو دفارہ ہے وہ صرف شہزادیوں میں ہوتا ہو گا۔ اگر مختار اس شہزادی لڑکی سے شادی کر کے بھی قہیں پریشان کرتا ہے تو وہ تمہارے حسن کو اس سے بڑا خراج اور کیا ادا کرے گا۔ میں نے تمیں کتنی بار بتایا ہے کہ نگینہ بہت خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت ہے، بہت بہت بہت ہی خوبصورت سی مگر جب وہ میری رخشی کے سامنے آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔“

محمود اپنا ماتھا دہانے لگا۔ پھر بولا۔۔۔ ”جیسے وہ سکی کے پیگ کے سامنے چاتے کی پیالی رکھی ہو۔۔۔“
”رخشی مسکراتی تو محمود بولا۔۔۔“ ”جیسے کبوتری کے سامنے چڑیا بیٹھی ہو۔۔۔“
رخشی نے اب کے ہنسی پر ٹری مشکل سے ضبط کیا۔ اور محمود بولا: ”جیسے بن لگکے کے گوشے میں اینکسی کھڑی ہو۔۔۔“

اب کے رخشی ہنسی پر ضبط نہ کر سکی اور نیچتا پورے کلب کی گزیں اس میز کی طرف مر گئیں جہاں رخشی اور محمود نے جیسے درآٹی شو شروع کر کھا تھا۔

”شریر!“ رخشی نے ہاتھ پڑھا کہ محمود کے گاں کی یوں چکلی جیسے اس کے سامنے دو چار برس کا بچہ بیٹھا ہے۔ پھر وہ تنک کر بولی۔ ”شیوکب بنایا تھا؟ کتنی بار کہا ہے کہ دوبار شیو بنایا کرو۔ ایک صبح کو ایک شام کو۔۔۔ لے کے میری بے چاری انگلیوں کی پوریں چھپیں دیں!“

محمود اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پوروں کو چھومنے لگا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ رکھ کر بولا: ”اب کہو۔“

رخشی نے اس کے گاؤں پر تھیلیاں ملتے ہوئے کہا: ”بس میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ مختار شادی کے ایک ڈیڑھ میٹنے بعد ہی نگینہ سے کیوں بدک اٹھا ہے؟“ ”تم نے سائیکلو جی کا ایم اے تو کر لیا ڈارنگ؟“ محمود بولا: ”اب کیا مختار کی سائیکلو جی پر تھیس لکھنا ہے؟“

رخشی کو سہارا ملا۔ ”بس عادت سی ہو گئی ہے ہر شخص کے اندر گھس جانے کی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اس کے اندر کیا ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے، جب نگینہ کے ڈیڑھی، ڈر ناک پارٹی سے فارغ ہو کر نگینہ کو ساتھے جانے کے لئے لان میں گئے تھے تو مختار کا سا پچھلنا، سرخ و سفید، چوراچکلا، اپالو کا سا ہمینہ سم جوان، نگینہ کے قدموں پر سر رکھے پڑا تھا اور جب نگینہ کے ڈیڑھی نے اسے اٹھنے کو کہا تھا تو پڑتے ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ نہیں انکل ابھی نہیں۔ ابھی میرا سجدہ مکمل نہیں ہوتا۔ یاد ہے وہ اپنے شاہ بلوط کلب کی کلکشوم اور جین کی سی رنگیوں کو چھوڑ کر اس پام گرد و کلب میں چوروں کی طرح آتا تھا اور مجنون کی طرح اپنی سیلی کیتے سب کے سامنے باقاعدہ آنسوؤں سے رو تا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر۔۔۔“ ”ہاں ہاں، کیا فرق پڑتا ہے ڈارنگ؟“ محمود نے چھٹے پیگ کے باقی نصف کو غصہ چڑھا کر کہا۔

اچانک اس کے تیور بگڑ گئے اور وہ خاصے جذبے سے بولا: ”مگر یاد رکھو اگر بات اس سے آگے بڑھی تو میں مختار کو مار داؤں گا۔ وہ میرا دوست ہے مگر دوست ہی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔ قابل نے تو اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا تھا!“ ”لہیں مودی ڈیرا!“ رخشی اٹھ کھڑی ہوتی۔ ”تم اور ایسی جانوروں کی سی بات؟“

پھر اُس نے جھک کر محمود کی ٹھوڑی کو انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑا
اور پچھے کی طرح تسلسل کر بولی۔ ”اچھے اچھے، منے منے، پیاۓ پیاۓ پچھے ایسی
باقیں نہیں کلتے!“

محمود نے رخشی کا وہی ساتھ پکڑ کر اس زور سے چو ماکہ چٹا خ کی اس آواز سے
پورا لکب ایک بار پھر متوجہ ہو گیا۔

”تو پھر کل میں یہاں نہیں آ رہی ہوں۔“ رخشی بولی۔

”صرف کل یا محمود نے فیصلہ سنایا۔“

”ہاں ہاں صرف کل یا رخشی نے اتفاق کیا۔“

”میری قسم کھاؤ۔“ محمود نے مُطالبہ کیا۔

”تماری قسم“ رخشی فوراً بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے رخشی ڈار نگ۔“ محمود بولا۔ ”بس یہی ہو گانا کہ کل میں آدھی
کی بجائے پوری بوقت پی لوں گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ پھر وہ گانے لگا اور ساتھ
ساتھ چکلی بجلنے لگا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے جی کیا فرق پڑتا ہے؟“

رخشی نے محمود سے صرف ایک رات کی جھٹی لی تھی مگر وہ دوسرا رات بھی
نہ آئی۔ محمود نے پہلے ایک پیگ پیا مگر پھر نوپری بوقت منگالی اور اس بوقت کو سامنے
رسکھے وہ رخشی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا اور لکب کے دوسرا
ممبر سے لکھیوں سے دیکھتے اور محفوظ ہوتے رہے۔ پورے لکب سے رخشی
کو چھین کر محمود نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ بھرے ہوتے ہاں اور بار کے کاڈنٹر
پر جمع، جوم اور ساتھ کے کمروں اور بیبری دروم سے کوئی بھی اس سے یہ پوچھنے نہ آیا
کہ آج وہ دو باتوں کیوں ہے، رطبوں کیوں نہیں ہو رہا ہے، وجہ سمجھی کو معلوم نہیں۔ لکب

میں رخصی کا نہ آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سمجھتے سب تھے مگر سب خاموش تھے اور اس خاموشی سے ہر اس بھی تھے جیسے کوئی طوفان ٹوٹنے والا ہے۔

یہ حیرت اور ہر اس بس پہلی رات تک تھے۔ وہ حیران ہوتے رہے کہ محمود نے بیرے کو بلا کر بوقت کھلوائی اور پیگ پر پیگ چڑھانے لگا۔ اور ہر اس بھے کے بوقت ختم ہونے والی تھی اور اب محمود نیا پیگ بنانے کے لئے گلاس میز پر رکھتا ہیں تھا بلکہ دے مارتا تھا۔ ابھی وہ اٹھے گا اور جو پہلا شخص اس کے سامنے آئے گا اسے گریبان سے پکڑ کر اس پر گولیوں کی بوچاڑ کر دے گا۔ شرایبوں کے آوٹ ہونے کے اپنے اپنے اسلوب ہوتے ہیں۔ کوئی ایک دم چپ ہو جاتا ہے کہ کوئی دُنیا کی بے شباتی پر زار زار رونے لگتا ہے۔ کوئی اپنے پاس میٹھے ہوتے شخص کے قدموں پر یہ کہتے ہوتے گر جاتا ہے کہ وہ کتنا بے مثال آدمی ہے اور کوئی چیزیں توڑنے اور کھوپڑیاں پھوڑنے میں لگ جاتا ہے۔ محمود آوٹ ہونے کے بعد یہی چھوڑتا تھا۔ پہلی رات تو اس نے عالیہ تک کوئی لفت نہ دی جو رخصی سے پہلے محمود کی بلانا غدر کی ساختی تھی۔ آج میدان خالی دیکھ کر وہ اس کی طرف یوں والہانہ انداز سے بڑھی جیسے اس کا بیس کمیں تیچھے رہ جائے گا اور وہ آگے بڑھ جاتے گی۔ آج تو وہ یوں سچ سجا کر آئی تھی کہ اپنے آپ سے بھی نسلکی پڑ رہی تھی۔ وہ آتی اور محمود کے اتنے قریب جا کھڑی ہوئی کہ کسی اور کے اتنا قریب جاتی تو وہ اس کے نگئے پیٹ پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ مگر محمود نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، انھا اور بار کے کاؤنٹر کی طرف ٹھیل گیا۔ پھر جب عالیہ نہایت غصے میں ملٹی تو وہ مسکرا تاہماً اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ کلب میں سب کی نظریں ادھر رخصی کے انتظار میں اندر باہر کھلنے والے نیم دروازے پر اور ادھر محمود کے غیر منطقی اطمینان کی وجہ سے محمود پر لگی تھیں۔ بس اتنا ہتھا کہ اس رات جب محمود انھا تو خط مستقیم میں چلنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا اور نہ دُو

کسی سے ال جھا نہیں۔ جب وہ چلا گیا تو ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے دو گوں نے کورس میں گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کوئی فرق نہیں پڑتا جی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ پھر جب وہ چیخ پیچ کر قیقے لگا رہے تھے تو نیم دروازے پر سے محمود کامران نو دار ہوا۔ پوٹے کلب پر جیسے نشانے کی جھاڑ دیپھر گئی اور محمود جیسے مسلمان ہو کر واپس چلا گیا۔ بھب رخشی دوسری رات بھی نہ آئی تو سب کو تشویش لاحق ہوئی مگر جب محمود کو اپنے سامنے دیسکی کی بوتل رکھے بت بنے بیٹھا دیکھا تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ لوچپور دوں پر سور پڑ گئے۔

اور یہ اسی دوسری رات کا واقعہ ہے کہ جب بہت دیر ہو گئی تو محمود کے بت میں حرکت پیدا ہوتی۔ وہ انہا۔ اس نے بوتل کو گردن سے پکڑ کر فرش پر دے مارا اور سب دو گیوں چونک پڑے جیسے کلب میں لم پھٹ گیا ہے۔ محمود دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑا تھا جیسے اس نے بوتل نہیں توڑی، مختار کو قتل کر دیا ہے اور فرش پر شراب نہیں بہر رہی ہے، رخشی، مختار کے چینگل سے نکل کر اس کی طرف پکی آرہی ہے۔“ یہ بوتل میری تھی۔“ اس نے آس پاس جمع ہوتے ہوئے کلب کے اہلکاروں کو ڈالنا۔“ یہ میری مرضی ہے کہ میں اسے پیوں یا توڑ دوں یا کسی کے سر پر دے ماروں!“ سب چپ چاپ پلٹ گئے اور محمود اندر باہر کھلنے والے دروازے میں سے اس تیزی سے نکلا کہ دروازہ دیر تک اندر باہر کھلتا رہا۔

اور یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے۔ رخشی شام سے مختار کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ محمود کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتی ہے، مگر مختار نہیں مانتا تھا۔“ وہ مجھے یا تمہیں مار ڈالے گا رخشی ڈیر۔“ وہ کھتار رہا۔“ وہ میرا پُرانا یار ہے۔ میں اسے پوری طرح جانتا ہوں۔ شکست کھانا تو اسے آتا ہی نہیں۔ اسی لئے تو وہ اب کے ایکیش میں بھی

کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غلط باتیں کرنے لگے ہیں اس لئے وہ ہار جاتے گا اور وہ ہارنے کی بجائے مارنا یا مر جانا بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے بھی ایکشن لڑنے سے روکا تھا، مگر میں لڑا اور ہار گیا۔ اس کی سیاسی بصیرت بہت تیز ہے۔ اس کی بھی بصیرتیں بہت تیز ہیں اور اپنی انہی بصیرتوں کو کند رکھنے کے لئے تو اتنی بہت سی پیٹا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ سے ڈرتا ہے کہ وہ ہوش میں رہے گا تو نہ جانے کیا کہ بیٹھے گا۔ سو ڈیزیر، اسے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے حالات میں آدمی کو آگاہی خود بخود ہو جاتی ہے۔ تم محمود کے پہلو میں تھیں، مگر مجھے آگاہی حاصل ہوتی کہ اندر سے تم میری ہو۔ محمود کو بھی معلوم ہو جاتے گا کہ اندر سے تم اس کی نہیں تھیں تب وہ کوئی نہ کوئی خطرناک حرکت ضرور کرے گا اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کچھ چھوڑ کر لا ہو چلے جانا چاہیئے۔“

”مگر تارے پیارے“ رخشی نے کہا۔ ”اس نے مجھے عشق کیا ہے۔ وہ میرے بغیر پاگل ہو جائے گا۔ میں اسے ایسی موت مرتا نہیں دیکھ سکتی کہ ایک لکھ پتی کو گلکیوں کے نیچے پتھر مارتے پھریں۔ اگر تم مجھے زملتے تو دنیا کا کوئی بھی مرد مجھے خسود سے نہیں چھین سکتا تھا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے بغیر کیسا ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے معلوم ہو جائے کہ اب اسے میرے بغیر زندگی گزارنا ہو گی۔ منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بن ہم بازو میں بازو ڈالے اس کے سامنے گزر جائیں گے اور وہ سب سمجھ جائے گا۔ وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی بصیرتیں بہت تیز ہیں۔“

”بیشتر طیکہ آٹھ نہ ہوا۔“ تھمارے نے کہا۔ ”آٹھ ہوا تو وہ کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گا۔“ رخشی بولی۔ ”معلوم ہوتا ہے تم اسے جانتے تو ہو مگر طیک سے نہیں جانتے۔ وہ شور بہت مچاتا ہے مگر آٹھ بہت بھت کم ہوتا ہے۔ مشраб کی عادت ہو گئی ہے۔“

شراب وہ اسی طرح پیتا ہے جیسے چلتا ہے یا سانس لیتا ہے۔ چلو انھوں۔“
اندر بامہر کھلنے والا دروازہ اندر کھلا تو کلب میں ایک بار پھر ایسی فضا پیدا ہو گئی
جیسے محمود نے بوتل فرش پر دے ماری ہے۔ رخشی اور مختار شناساؤں سے ہیں یو ہیں
کہتے جب محمود کی خاص میز کے پاس پہنچے تو ایک دیر طشت میں بوتل کی کرچیاں جمع
کر رہا تھا۔

رخشی جیسے سب سمجھ گئی۔ دیر سے پوچھا۔“ یہ بوتل محمود نے خود توڑی یا ٹوٹ
گئی؟ ”

“ خود توڑی جی یا دیر بولنا۔ ” کھینچ کر فرش پر دے ماری اور اٹھ کر جائے گئے۔“
رخشی نے ایک لمبے سوچا۔ پھر بولی۔“ تو پھر تارے پیارے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔
ہمیں اس سے نہیں ملنا چاہیئے۔ ”

وہ روزانہ ایک ہو ٹول بدلتے تھے اور اب تک چار ہو ٹول بدل کچکے تھے پانچوں
ہو ٹول میں قدم رکھتے ہی مختاز بولا۔“ رخشی دیر۔ میرا جی چاہتا ہے میں نگینہ کو دیکھوں کہ
وہ میرے بغیر کیسی ہے۔ یقین کرو دیر، اگر مجھے قمر نہ ملتیں تو میں دنیا کی کسی بھی عورت
کے لئے نگینہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے کبھی کبھی گربیت یوٹی کہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم
تھا کہ رخشی کے روپ میں ایک سپریم یوٹی بھی موجود ہے۔ ”

“ یہ تو میں مانتی ہوں۔ ” رخشی بولی۔“ خوبصورت تو وہ بلا کی ہے اور یاد رکھو۔ میں
دنیا کی پہلی عورت ہوں جو دسری عورت کی خوبصورتی کا اعتراف کر رہی ہے۔ ”
یہاں رخشی نے اپنی ہنسی کا عجاذ کھایا۔—“ بس تم نے اس کی جو باتیں مجھے بتائی
ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا خوبصورت اس کا جسم اور چہرہ ہے، اتنا ہی جو نہ
اس کا دل اور دماغ ہے۔ دیسے یاد رکھو وہ بھی محمود کی طرح تینیں اور مجھے قتل کر سکتی ہے۔ ”

جو بیوی اپنے شوہر کو صبح تھپڑا مار کر جگاتے اور ٹھوکر مار کر اٹھاتے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔“

”اور پھر کہتی ہے کہ میں نے تو پیار سے تھپڑا مارا، میں نے تو پیار سے ٹھوکر ماری“ مختار بولا۔

”لوپھر وہ پیار سے روپا لور کی گولی بھی اتار سکتی ہے دوسرے کے سینے میں“ رخشی نے کہا۔

”نهیں ایسی بات نہیں“ مختار نے رخشی کی تردید کی ”ایسے معاملات میں گولی انہیں ماری جاتی ہے جن سے محبت کی جاتی ہے۔ اس سے محبت میں نے کی ہے۔ اس نے نہیں کی اور وہ ایسی پاگل نہیں کہ راہ چلتے کو گولی مار دے۔ دیکھو نہ ڈیکھو ہم چار پانچ روز سے ہو ٹلوں میں بھلکتے پھرتے ہیں اور سب فائوسٹار ہو ٹلیں۔ اسے تشویش ہوتی تو وہ کسی ہو ٹل سے میرے بارے میں پوچھتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے نکاح کے وقت اپنا جو بیکار اس کے نام منتقل کر دیا تھا تو وہ اسی پر صابر و شاکر ہو گئی ہے۔“

”تو پھر تمہیں یہ دیکھنے کا شوق کیوں ہے کہ وہ تمہارے بغیر کیسی ہے۔“

”جیسے تمہیں محمود کو دیکھنے کا شوق تھا۔“

”مگر وہ شوق تو محمود کو دیکھے بغیر پورا ہو گیا“ اور یہ کہہ کر رخشی نے اپنی ہنسی کے ذریعے چاندی کی ناخنی گھنٹیاں بجا یعنی۔

مگر پھر لوں ہوا کہ گھنٹیوں کی یہ آوازیوں بیچ ہی میں کٹ کر رہ گئی جیسے کسی دیونے تڑپتی ہوتی گھنٹیوں کو اپنی مٹھی میں جلدیا ہو۔

سامنے کے دروازے میں سے محمود اور ٹگینہ، بازو میں بازو ڈالے ہال میں داخل ہوتے۔ دونوں کے لبوں پر وہ مسکرا ہٹیں تھیں جو آنکھوں کو بھی چمکا دیتی ہیں اور پھر وہ

کو بھی دمکا دیتی ہیں ۔

مخمار اور رخشی دونوں جیسے بجلی کے ایک چھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب وہ اٹھنے تو محمود اور نگینہ کے قدم جیسے فرش کی ٹانکوں نے پکڑ لئے۔ طرفین ایکدہ کے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے برسوں کے بعد ملے ہیں تو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ پھر ادھر سے مختار اور رخشی اور ادھر سے محمود اور نگینہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ رخشی محمود سے خوف زدہ ہے اور مختار نگینہ سے۔ مگر پھر یوں ہوا کہ محمود نے قریب آ کر کہا۔ «ہیلو مختار» اور رخشی کے بازو میں بازو ڈال کر پلٹا تو مختار بولا۔ «ہیلو»

«ہیلو» نگینہ نے بازو اٹھاتے بغیر جیسے اپنا پورا جسم مختار کے جسم میں پیوست کر دیا اور پھر اس کے بازو میں بازو ڈال کر دوسری سمت چل پڑی ۔

سارا معاملہ یوں چپ چاپ طے پا گیا جیسے دونوں مال کا تبادلہ کرنے آئے

ایک عورت تین کہانیاں

میں گاؤں کی تختی سی ایک بچی ہوں۔ میرا نام فورخا توں ہے۔ میں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے کہ اگر خدا نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے عقل و شعور سے بہرہ دو کر دیا ہوتا تو میں ایک ہونا کچھ مار کر مر جاتی۔ میں اشرف المخلوق کے ایک فرد کی حیثیت سے دُنیا میں آتی تھی۔ مگر میں نے جس کو تھے میں جنم لیا، وہ مرت کی طرح تاریک تھا۔ اس کے ایک کوئے میں میرے بابا کی اکلوتی بھری بندھی تھی جو بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تھی اور انھکر ایک بھر جھبری سے اپنا جسم جھاڑتی تھی تو اس کی غلاظت اڑ کر میری چیختی ہوتی ماں کے بالوں میں انھک جاتی تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی دُنیا کی جس پہلی چیز نے میرا استقبال کیا وہ اس غلاظت کا ایک چھینٹا تھا، جو سیدھا میرے مانچ پر آگرا اور میری تقدیر بکھر گیا۔ یہ انگ بات ہے کہ اس کے بعد میرے کان میں اذان بھی دی گئی اور مجھے چیختروں میں پیسٹ بھی لیا گیا مگر غلاظت کا چھینٹا اس سے پہنچے ہی اپنا کام کر چکا تھا۔

میری آمد پر میری ماں دونوں ٹمک روئی رہی۔ میرے بابا نے بھی مجھے دیکھا، تو ایسا ٹھاٹھا نظر آ رہا تھا جیسے اس کی بکری اچاہم کھڑی کھڑی ڈھیر ہو گئی ہے۔ عورتیں میری ماں کے ساتھ یوں اظہار ہمدردی کرتی تھیں جیسے اس کے ہاں کوئی پیدا نہیں ہوا ہے۔

کوئی مر گیا ہے۔ اس کے باوجود میں اپنی ماں کی آنتوں کا ایک ٹکڑا تھی۔ وہ مجھے سینے سے چھٹاتے رہتی اور میری ناخنی ٹھوڑی کو اپنی ایک انگلی کی پورے دبادبا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتی رہتی، پھر جب میں مسکرانے لگتی تو وہ رو نے لگتی اور میرے بابا سے کہتی ہے: اس کی طرف دیکھو، میں نے اس کی ٹھوڑی کوڑا سا چھوپیا تو مسکرانے لگی۔ اللہ رحم کرے، یہ مسکراتی بہت ہے۔“

چند دنوں کے بعد میری ماں نے چارپائی سے اُتر کر بکری کی مینگنیاں سکھانا، دودھ بیچنا، دال اباانا، اور روٹیاں پکانا شروع کیا، تو میں ایک فالتو چیزیں کر رہ گئی۔ اتنی فالتو کو ایک بار تو بابا مجھ پر بیٹھتے بیٹھتے رہ گیا۔ بیٹھ جاتا تو میں دنی کا ذرا سا گالاہی تو ختنی، پچک کر رہ جاتی، مگر بابا بیٹھنے کو جھکاہی تھا کہ ماں نے چین مار دی اور وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا: “توہہ ہے، میں سمجھا کوئی چیختھڑا پڑا ہے۔ یہ کبھت کیسی ہے کہ رو تی بھی نہیں؟ اور ماں نے کہا تھا: ہمیں یہ چاری توڑی صابر ہوتی ہیں۔ رو تے تو بیٹھے ہیں۔“

گرتی پڑتی میں اتنی بڑی ہو گئی کہ بیٹھے بیٹھے پورے صحن میں گھوم آتی تھی۔ مجھے جو چیز بھی ملتی اسے پکڑ کر منہ میں ڈال لیتی مگر ان دنوں میرے منہ میں کچھ گیا تو وہ لکنکر تھے یا بھوے کے نئکے، بکری کی مینگنیاں یا اسٹی کے دھیلے۔ مگر میں اور تھاہی کیا کہ میرے قبضے میں آتا۔ ایک بار چوہپے میں سے انگارہ اٹھا کر بھی چکنا چاہا مگر ماں نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور گایاں دینے لگی اور رو رو کر میرے بابا سے کہنے لگی کہ یہ چاری کے لئے ایک آنے کا جھنجھنلا دادو۔ مگر بابا بولा: “ایک آنے ہوتا تو تباکونہ لے آتا۔ دیرے حنکے کے لئے ترس رہا ہوں۔“

اب میں سات آٹھ برس کی ہوں۔ ہمارے پڑوس میں چودھری پیراں دتا کا گھر ہے، جس کی بیٹیوں کے پاس انگریزی گڑیاں ہیں جو بیٹتی ہیں تو انہیں بند کر لیتی ہیں اور

اٹھتی ہیں تو مکر مکر گھورنے لگتی ہیں اور ان کے سنہری بال ہیں اور گالوں پر لالی ہے۔ ماں نے مجھے بھی کپڑے کی ایک چیٹی سی گڑیا بنا کر دی مگر یہ چودھڑا نیاں کہتی ہیں کہ میری گڑیاں گڑیوں کی میراث ہے۔ اسی لئے میری ان کی دوستی نہیں ہو سکی۔ میری دوستی تو تو گامے موچی کی بیٹی تارو سے ہے جو ننگے پیر رہتی ہے۔ ایک بار میں نے کہا: ”موچی ہو کر ننگے پیر رہتی ہو۔ یہ بھی کیا بات ہوتی!“ وہ بولی: ”وہی بات ہوتی جیسے تم کسان کی بیٹی ہو کو جھوکی رہتی ہو۔“ میرا اس کا حساب برابر ہو گیا اس لئے میری اس کی دوستی ہو گئی۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح مدرسے نہیں جاتی۔ بابا مجھے قاعدہ، فلم، تختی، سلیٹ خرید کر نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ ”بیٹی تمہیں منشیانی نہیں بنتا ہے۔ اپنی ماں کی طرح مینگنیاں سکھانی ہیں۔“ بھی تماری نانی دادی نے کیا۔ یہی ان کی نانیوں دادیوں نے کیا اور پھر اگر میرے پاس تختی سلیٹ کے پیسے ہوتے تو میں دوسری بکری نہ خرید لیتا ہو۔“ میں صبح سویرے گھر میں جھاڑو دیتی ہوں۔ بجھری کے تھان صاف کرتی ہوں کنوئیں پر سے پانی کی گلگریا بھر لاتی ہوں۔ جنگل میں جا کر جھاڑیوں کی خشک ٹہنیاں توڑ لاتی ہوں۔ مانی جی سے روزانہ نماز کا سبق لیتی ہوں۔ آج کل میرا سبق ہے صراط الذین انعمت علیهم۔ وہ کون سا کام ہے جو کسان عورتیں کرتی ہیں اور میں نے اس عمر تک میں نہ کر لیا ہو۔ میں نے مٹی کھو دی ہے، گھاس کاٹا ہے، دیواریں لیپی ہیں۔ میرے ہاتھوں پوچھتے ہیں۔ میری ایڑیوں میں دراڑیں ہیں، میرے بالوں میں دھول ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میرے ہونٹوں پر پڑیاں ہیں اور پچھلی چودہ پندرہ عینہ دن میں میری ہتھیلیاں مہندی کے ایک دھنے تک کے لئے ترستی رہی ہیں۔

(۲)

میں گاؤں کی ایک کنواری ہوں۔ میرا نام نور خاںوں ہے۔ میرے کپڑے ٹیا لے ہیں مگر میری آنکھوں میں چراغوں کی بویں کا نپتی ہیں۔ میرا کرتہ جگہ جگہ سے

مسک گیا ہے مگر میرے چہرے پر حیاہ کی گلائی چادر ہے۔ میرے سر پر لانبی لانبی
گھاس کامن بھر گئا ہے مگر میرے ہنوثوں پر ملکے چکے گیت ہیں۔ میں ایک اپنے
باپا ہی کی نہیں، سارے گاؤں کی عزت ہوں مگر کیا کروں کہ آخر ایک عورت ہوں
اور صد یوں سے عورت کو دیکھتے رہنے والے مرد اسے اب تک یوں انگھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھتے ہیں؛ جیسے میں پچین میں ہوا تی جہاڑ کو دیکھتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں گاؤں
کی پلی گلی میں داخل ہوتے ہیں بیسوں نگاہوں کا نشاذِ بن جاؤں گی اور نگاہوں کے
اس ہجوم میں اڑو کھڑا نے لگوں گی۔ گاؤں میں اور جوان لڑکیاں بھی ہیں اور مرد انہیں بھی
دیکھتے ہیں مگر یوں ہجوم کر کے نہیں دیکھتے جیسے مجھے دیکھتے ہیں۔ مجھ پر نگاہوں کی اس بیگانہ
کے دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ تارو نے مجھے بتایا ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ خود تارو بھی
خوبصورت ہے مگر وہ کہتی ہے کہ سانوں تک اگر خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور موچنیں،
ناٹنیں، دھونیں، میرا شنیں اور کھانیں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ وہ صرف موچنیں
ناٹنیں، دھونیں، میرا شنیں اور کھانیں ہوتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا بابا اپنے
سولہ سترہ سال سے بدستور ایک ہی بکری کا ماں ہے اور گاؤں کی چوپال پر جا کر چپ چاپ
بیٹھا رہتا ہے کیونکہ غریب ہونے کی وجہ سے اس کی بات میں وزن نہیں ہوتا۔

گھاس کا گھٹھا اتار کر وہ سب کام کروں گی جو میری ماں اور اس سے پہلے اس
کی ماں اور اس سے بھی پہلے اس کی ماں کرتی رہی ہے۔ میں چولھا پھونکوں گی، ٹپوں
کے چوڑھریوں سے گائے بھینس کا گوبر مانگنے جاؤں گی اور اگر مل گیا تو اپنے تھاپوں گی،
جھاڑ دوں گی، گارا بناوں گی۔ پچھت اور دیواریں لیپوں گی، بابا کے لئے حکیم جی سے
ادھار عرق لاؤں گی۔ ماں کے لئے پیری جی سے ادھار تقویٰ حاصل کروں گی، پھر جب
رات کو چنتھیڑوں کے انبار میں سونے کی کوشش کروں گی تو میرے ماں اور بابا آپس
میں کھسر پھسر کریں گے۔ وہ کچھ ایسی باتیں کریں گے جیسے میں ان کی بیٹی نہیں ہوں، میتت

ہوں اور وہ میری شادی کا نہیں سوچ رہے ہیں، میرا جنازہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ اس وقت میری ماں میرے بابا کو بتائے گی کہ وہ اپنی شادی پر چاندی کے جو لکنگن لاتی تھتی وہ اس کی بیٹی کے جہیز کے لئے محفوظ پڑے ہیں۔ یہ لکنگن میری ماں کو اس کی ماں نے دیتے تھے اور اسے اس کی ماں نے دیتے تھے اور کہتے ہیں کہ یہ لکنگن اس زمانے کے ہیں جب پنجاب پر سکھوں کا راج تھا اور دلی کا بادشاہ جیتے ہی مر گیا تھا۔ پھر بابا بتلتے گا کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر بکری بیخ دے گا اور گزر بسر کے لئے کھیتوں پر مزدوری کرے گا یا چودہ ری کے جو نئے مکان بننے والے ہیں ان کے لئے گاراڈ ہوتے گا۔ میری ماں روتنے روتنے کھانے لگے گی تو پانی میں پیر جی کا تعویذ گھول کر پی جاتے گی۔ میرا بابا دنے پر ضبط کرتے کرتے ہانپنے لگے گا تو عرق کا ایک گھونٹ چڑھا لے گا اور میں یوں محسوس کر دوں گی جیسے میں جوان نہیں ہوتی ہوں، مر گئی ہوں۔ میں ایک بہت گھری بہت ہی گھری قبر کے کنارے پہنچ گئی ہوں اور میرے ماں اور بابا مارے مجتہ کے بجھے اس میں دھکا دینے والے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اس کنوں کی سی قبر کے درمرے سرے پر وہ سورج نکل آتے گا جو کبھی نہیں ڈوبتا۔

میں عجیب عجیب باتیں سوچتی ہوں۔ میں کسے بتاؤں کہ میں کسی کسی باتیں سوچتی ہوں۔ میں تاردموجن سے سب کچھ کہہ کر اپنا جی ہلکا کر لیتی گرددہ تو سال بھر پہلے بیاہ دی گئی اور ابھی چند روز پہلے اپنے مردہ پتھے کے ساتھ ہی مر گئی۔ ایک بار جب اسے ہوش آیا اور اسے پتہ چلا کہ اس کے ہاں تو مردہ پتھے پیدا ہوا ہے تو وہ تجھنے لگی۔ میں میرا پتھے لاؤ۔ میں اس میں اپنی جان پھونک دوں گی۔ میں اپنے پتھے سے اس کی موت لے بول گی اور اسے اپنی زندگی دے دوں گی۔ میرا خدا ٹرا اچھا ہے۔ اس کو اس سودے پر کیا اعتراض ہو گا؟“ پھر دہ مردہ پتھے سے چھٹ گئی اور مر گئی مگر پتھے زندہ نہ ہو سکا۔

پڑوں کی ایک لڑکی کی شادی پر میں نے دوسری بست سی لڑکیوں سے مل کر گیت گا تے تھے تو نمبردار کی بیٹی چونکہ پڑی تھی اور اس نے سونے کی چوریوں سے پی ہوئی بانہہ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا۔ ”اب تو گانور یتے! کوئی اور نہ گاتے۔ صرف نوری گا تے گی۔ اس کی آواز میں پیتل کا کٹورا بجتا ہے“ پھر میں نے اہم سے گایا تو روئے نے لگی اور بولی ۔“ ہاتے ری اور گا۔ گاتی جا۔ تیری آواز میں تو چھریاں کھنکتی ہیں!“ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گاتے گاتے میں خود بھی روئے لگی اور یوں آنسوؤں کے تاروں نے نمبردار کی بیٹی کو اور مجھے دوستی کے بندھنوں میں جکڑ لیا۔

مگر چھر یہ دوستی عجیب طرح ٹوٹی۔ ایک روز جب میں اس کے پاس بیٹھی ہوئے ہوئے گاہری تھتی اور وہ ردرہی تھتی تو مجھے بھی رونا آگیا۔ اب میں کیا بتاؤں کہ مجھے رونا کیوں آیا۔ بس یونہی میرا جی چاہا کہ رونا چاہیئے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تب یوں ہوا کہ اس نے آنچل سے اپنے آنسو پوچھے، انھی اور واپس آکر مجھے پانچ روپے دیتے کہ جان سے ایک کروتے کا کپڑا خرید لے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے میرے گانے کے جواب میں مجھے گالی دی ہے۔ میں نے صرف اتنی سی بات کہی کہ بی بی تو نے اپنے آنسو تو آنچل سے پوچھے اور میرے آنسو پوچھنے کے لئے پانچ روپے اٹھا لائیں! کیوں؟ کیا میرے آنسو فالتو ہیں؟ میں نے یہ کہا اور چھروہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

اب میں اکیلی ہوں۔ میرے ماں اور بابا بھی اب مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ مجھے صرف دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ اور پھر میں وضو کر کے نماز پڑھنے لگتی ہوں اور نماز پڑھتے ہوئے سوچتی ہوں کہ میری جوانی بھی عجیب جوانی ہے کہ میرے ہونٹ۔ سرخ تو ہیں مگر شعلوں کی طرح سرخ ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک تو ہے مگر دیت بھی تو چمکتی ہے میری رگوں میں خون کی جگہ آنسو دوڑتے ہیں اور میں اوپر سے سانس لے رہی ہوں مگر اندر سے چینخ رہی ہوں۔

(۳)

میں گاؤں کی ایک عورت ہوں۔ میرا نام نور خاتون ہے۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ میں اس لئے بھی بہت دُکھی ہوں کہ میری پانچوں بیٹیاں زندہ ہیں اور میرا گھر والے مکان کی چھت کے لئے مٹی کھو دتے ہوئے مٹی کے ایک توڑے تلے دب کر مر گیا ہے۔ جب اس کی لاش گھر میں لائی گئی تو اس کے نہنوں اور کانوں اور انکھوں میں مٹی بھری ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک دھار نکل کر آس پاس کی مٹی میں آکر مل گئی تھی اور مٹی کا عجیب سازنگ ہو گیا تھا جیسے گہنے لگے تو چاند کا زنگ ہو جاتا ہے۔ میرے اکلوتے بیٹے کا بھی یہی زنگ ہے۔ وہ گاؤں کے ایک بڑے آدمی کا فرازدہ ہے۔ اس کی زینتوں پر ہل بھی چلاتا ہے۔ اس کے لئے لکڑیاں بھی کاٹ لاتا ہے، اسے مرغیوں کے انڈے بھی جمع کر کے دیتا ہے، وہ سفر پر جانتے تو اس کا تھیلا اٹھا کر اس کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ جھاگلتا ہے۔ وہ تھک جاتے تو اس کا جسم دا بنا ہے۔ ایک روز کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کے جسم گوشت سے نہیں ریشم سے بنے ہوتے ہیں۔ ذرا سائبے وقوف ہے لیکن محنتی ہے۔ اس لئے مجھے اس کی بے دوقنی کھلتی نہیں۔

ایک دن اس نے کہا تھا۔ ”ماں ابھی ویسے تو بڑی پیاری چیز ہے مگر یہ کیا بات ہے کہ جب میں اپنی پانچ بہنوں کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے میں پانچ چاقواترے ہوتے ہیں۔ ماں انہیں زیادہ باہر نہ جانے دیا کرو، ماں انہیں چھت پر نہ چڑھنے دیا کرو۔ ماں انہیں کسی کوٹھے میں بند کر دو۔ ماں انہیں کسی ستون سے باندھ دو۔ ماں انہیں زہر دے کر مار ڈالو۔ میں ان کی شادیاں نہیں کر سکوں گا۔ شادیاں نہ کر سکا تو ان پر پھرے نہ دے سکوں گا۔ پھرے نہ دے سکا تو میں گاؤں والوں کی باتیں نہیں سن سکوں گا اور پھر یہ مار ڈالوں گا یا مر جاؤں گا۔“

میرا بیٹا پاگل نہیں ہے۔ وہ ذرا سابے وقوف ہے۔ چھوٹا تھا تو اچھا بھلا
سیا نا تھا۔ پھر جب اسے عقل آنے لگی تو بے وقوفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کہتا تو سچ ہے
مگر سچی بات ہی بے وقوفی کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے جس گھر میں ایک وقت
سوکھی روزی پر اور دوسرا وقت بخشنے ہوتے داؤں پر بسر ہوتی ہو، وہاں جہیز کہاں سے
آتے گا اور جہیز نہیں ہو گا تو بُر کہاں سے آتے گا۔ — وہ سچ کہتا ہے غریب
لوگ کے موجود ہیں مگر وہ اپنے سے بھی زیادہ غریب لوگوں سے کیوں شادی کریں۔
ہم سے بھی زیادہ غریب گھرانے موجود ہیں۔ یہی ہمارا پڑو سی احمد دین ہے۔ اس کے
صحن میں دو بیڑیاں ہیں۔ بیر پکتے ہیں تو وہ ان بیڑوں کو جمع کر کے سکھا لیتا ہے اور
جب غدے کا توڑا پڑتا ہے تو ان خشک بیڑوں کو اکھلی میں کوٹ کر مٹھی مٹھی سارے گھر
والوں کو بانٹ دیتا ہے اور سونے سے پہلے "شکر الحمد للہ" کہتا ہے۔ احمد دین بڑا سیا
ہے۔ میرا بیٹا ذرہ اسابے وقوف ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے سے بھی غریب گھر میں تو
میں اپنی بہنیں کبھی نہ بھیجوں تو پھر میں کیا کر دوں! اے خُدا، میں کیا کر دوں — اے
انسانو، میں کیا کر دوں؟

کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ کاش میں تار و موجن ہوتی اور اپنے پہلے مردہ
پتے کے ساتھ ہی قبر میں اُتر جاتی۔ میں نے اتنی لمبی زندگی کو پاکر کیا پایا۔ میں تو سوچتی ہوں
کہ بظاہر میں آدھی صدی کی ہی مگر میری عمر توکل ایک سال کی ہے۔ وہ ایک سال
جو میں نے شادی کے بعد اپنے گھر والے کے ساتھ بچوں کے بغیر بس رکیا۔ پھر پتے
آنے لگے۔ ہر پتے کے ساتھ میرا گھر والا مجھ سے پیچے ہٹتا گیا اور آخر اتنا ہٹ گیا کہ
چھپ گیا۔ مولوی جی کہتے ہیں کہ دوح محفوظ میں یہی لکھا تھا۔ میں سوچتی ہوں جب
دوح محفوظ پر میری قسمت لکھی جا رہی تھی تو کیا فرشتوں کا قلم ٹوٹ گیا تھا۔
نمبردار کی بیٹی اب کسی افسر کی بیگم ہے۔ بیڑہاگ کی کوٹھی جتنی لمبی کار میں

ایک بار گاؤں آئی تو کار کو گاؤں کی بڑی گلی میں گھالاتی۔ میں سر پر دھڑے رکھے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ بولی: کبھی ہو؟ اس نے یہ سوال یوں پوچھا جیسے کہہ رہی ہے کہ بد نصیب! اس روز مجھ سے پانچ روپے کیوں نہیں لے لئے تھے کہ تیری بگڑی بن جاتی۔ میں نے کہا: میں خُدا کے فضل سے دیسی کی دیسی ہوں۔ قم بتا، تم کبھی ہو؟ اور وہ تیوری چڑھا کر چلی گئی۔

کہتے ہیں اس نے گاؤں کی بہت سی عورتوں کو جمع کر کے بتایا کہ دہان شہر میں بڑی عورتیں چھوٹی چھوٹی عورتوں کی بڑی مدد کرتی ہیں۔ سال میں ایک دوبار دیگیں پکا کر ان کے پھوٹوں کو میٹھے چاول کھلاتی ہیں اور انہیں دودھ کا سفوف دیتی ہیں۔ اب انہوں نے گاؤں گاؤں جانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

نا بہنو، ادھرنہ آنا۔ یہاں گاؤں میں تو پاکستان کی چار کروڑ عورتیں بستی ہیں۔ پہلے تم شہر کی آدھ پون کر دوڑ عورتوں سے قوبیٹ لو۔ قم تو انہیں کے آنسو جمع کر د تو کتنے تالاب بھر جائیں گے۔ یہاں آڈگی تو آنسوؤں کے سمندر دن میں ڈوب جاؤ گی۔ قم جو پیدل چلو تو تمہیں بخمار آ جاتے۔ تم ان سنگ زاروں اور خارستاؤں کے کڑے کوس کیسے طے کر دیگی؟ نا بہنو، نا۔ خود کشی مت کر د۔

مگر یہ میں باتوں میں کہاں نسلکی۔ اس وقت میری بیٹیاں قطار میں بیٹھی ایک دوسری کی جو تین دیکھ رہی ہیں۔ میرے بیٹے کے ہل کی چھال ٹوٹ گئی ہے اور وہ لہار سے نتی چھال بنوانے کے لئے کمیں سے قرض لینے گیا ہے۔ میں ملکے کا ڈھکنا اٹھاتے سوچ رہی ہوں کہ نتی فصل اٹھنے میں تو ابھی چار مہینے باقی ہیں اور ملکے میں تو چار دن کا بھی انماج باقی نہیں۔

نہ ملکے میں انماج ہے، نہ صندوق میں کپڑا ہے، نہ جیب میں پسیہ ہے۔ اگر کچھ ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی چنگاریاں ہیں اور دل میں جیسے کسی نے

بھروس کے چھتے کو چھپر دیا ہے اور ہوتوں کی اکٹی ہوتی پڑیوں میں یہ دعا اٹھی
ہوتی ہے کہ اللہ! تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک ایک
تو عطا کر دیا کر۔ ہم بڑے شاگرد اور صابر لوگ ہیں۔ ہم خون کے گھونٹ پی کر بھی
بھی سکتے ہیں، مگر گوں میں خون بھی تو ہو۔ ہم مٹی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں
مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں۔ ہم تو اشرف المخلوق ہیں۔ ہم تو زمین
پر تیر سے خلیفے ہیں۔

۱۹۶۲ء

ایک احمد قانہ محبت کی کہانی

بس رات تمہارے آباجان نے مجھے کھانے پر مدعو کیا تو وہ خوش بھی تھے اور حواس باختہ بھی۔ وہ اپنے ایک پُرانے ہم کتب سے مل کر خوش تھے، مگر انپی بیوی کی وجہ سے حواس باختہ تھے۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھے بتایا کہ رات ان کی بیوی تمہیں جنم دے کر رخصت ہو گیتیں۔

اب تم انیس بیس برس کی عالیہ ہو اور میں اکتا لیس سال کا صدیق احمد ہوں اور تمہارے آباجان نے چند روز پہلے اپنی سینتا بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ عمروں کا یہ تفاوت بظاہر طویل فاصلے پیدا کر دیتا ہے، مگر عالیہ! یہ فاصلے کتنے بے حقیقت، کتنے بے مفہوم ہیں! اور اگر ان کا کوئی مفہوم ہے تو قم، جو گُر کے معاملے میں مجھ سے اتنی دور ہو، مجھے اتنی پیاری کیوں ہو کہ میں تمہیں ہر دقت اپنی شہزادگ سے بھی قریب محسوس کرتا ہوں۔

تمہارے آباجان میرے ہم جماعت تو نہیں تھے، البتہ ہم کتب ضرور تھے۔ میں پہلے سال میں تھا اور وہ آخری سال میں تھے، مگر ایک سال تک ہم ایک ہی گرد پیس رہے اور ایک ہی کھیل کھیلتے رہے۔ پھر وہ فارغ التحصیل ہو کر کہیں چلے گئے اور جب اس کے کوئی چھ سال بعد میں ایک غیر ملکی فرم میں ایک اسلامی

کے لئے انڑو یو دینے آیا، تو میں نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ مجھے ان کے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے انداز سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ باقی دونوں افسروں سے بھی بڑے افسر ہیں۔ انہوں نے جب میری درس گاہ کا نام ستاف چور بن کر۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مسکراہست کو چھپا رہے ہیں، مگر عالیہ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ انسان قتل تک کو چھپا سکتا ہے، مگر اپنی مسکراہست نہیں چھپا سکتا۔ مسکراہست ہر فہرست ہوٹوں کی محماج نہیں ہوتی ہوٹوں پر قابو پاؤ تو آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ آنکھیں جھکا لو، تو چہرے کی زنگت مسکرانے لگتی ہے۔ میں حسابی کتابی آدمی، مجھے ان نازک چیزوں کا علم قطعی نہیں ہو سکتا تھا، مگر شاید تمہیں یاد نہ ہو، جب تم پہلی بار مسکراتی تھیں تو بالکل اس طرح مسکراتی تھیں کہ تم مسکرات کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھیں، مگر یہ تمہاری آنکھوں اور تمہارے چہرے، حتیٰ کہ تمہارے کافوں کی لوون تک سے پہنچی پڑ رہی تھی۔

تمہارے آباجان مسکراہست چھپانے کے باوجود آنکھوں سے مسکرا دیتے اور میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے، مجھ سے بہتر قابلیت کے امیدواروں پر بھی تربیح دی اور میں اس فرم کی ایک اہم اسمائی کے لئے چُن لیا گیا۔ انڈرو یو ختم ہوا اور میں باہر آیا تو کچھ دیر کے بعد ایک چپرائی نے آ کر مجھ سے پوچھا:

”کیا آپ کا نام صدیق احمد ہے؟“

میں نے کہا: ”ہاں۔“

بولا: ”آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔“

پھر اپنے دفتر میں دقار بھائی مجھ سے پٹ گئے اور بولے: ”میں نے تمہیں پہچان لیا تھا، مگر انڈرو یو میں اس کا انعامارٹھیک نہ ہوتا۔ سمجھ گئے نا۔“

ظاہر ہے کہ میں سمجھ گیا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے رات کے کھلانے پر مدعا کیا اور عالیہ! یہ اسی رات کا ذکر ہے

کہ قم پیدا ہوتیں۔

میں پانچ سال تک وقار بھائی کی فرم میں رہا جب مجھے اس سے بہتر نوکری مل گئی، تو خود وقار بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے دہاں چلے جانا چاہیتے۔ سو جب میں لاہور سے کراچی کی طرف چلا، تو قم نزدیکی کلاس میں جانے لگی تھیں اور مجھے صدیقِ انکل کہتی تھیں اور بہت موٹی اور لال گلابی لڑکی تھیں اور خوب صندھی تھیں اور خوب روتنی تھیں۔ تمہارے نقوش تمہارے بھوپے ہوتے گاؤں میں دبک گئے تھے۔ تمہیں لان میں ٹسلیوں کے پیچھے بھاگنا دیکھ کر ایک دن میں نے وقار بھائی سے کہا تھا کہ عالیہ کو دیکھ کر کبھی بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پہلوان سکڑ گیا ہے۔ میں جب وقار بھائی سے رخصت ہونے آیا اور تمہیں بھی بتایا گیا کہ صدیقِ انکل کراچی جا رہے ہیں، تو قم نے صرف اتنی بات کہی تھی کہ ہم بھی کراچی آئیں گے اور جب میں تمہارے گاں کو تھپتھپا کر اور تمہاری پیشانی کو جو چم کر چلا آیا تھا، تو مجھے قم مدنوں تک یاد نہیں آتی تھیں۔ صرف جب وقار بھائی نے کبھی بھاگ خدا نکھا تو تمہیں دعا میں مکھو دیں۔ میں کراچی سے ڈھاکے چلا گیا اور دہاں سے صرف ایک بار، آج سے یہی کوئی دو تین برس پہلے لاہور آیا۔ میں وقار بھائی سے بھی ملا، مگر اس وقت قم کا لمحہ لگی ہوئی تھیں سو میں تمہیں نہ دیکھ سکا، چنانچہ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ قم کا لمحہ جانے لگی ہوا میرے ذہن میں تمہارا وہی پرانا تصور قائم رہا کہ قم ایک موٹی، گول مٹول تھنی مٹھنی سی لڑکی ہو اور بہت چٹپوری ہو اور سخت صندھی ہو اور بات بات پر رونے لگتی ہو۔

آج سے کوئی ایک برس پہلے وقار بھائی نے مجھے ڈھاکے سے بلا لیا۔ ان کی فرم میں ایک نہایت عمدہ اسمی خالی ہوتی تھی اور وہ مجھے بھوپے نہیں تھے میں واپس آیا۔ پتوں کوان کے نھیاں میں چھوڑ کر جب میں لاہور میں وقار بھائی کی کوئی پڑھی پر آیا، تو قم باہر لان میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا، قم اٹھ کھڑی ہوتیں اور

کہا: ”فرمایتے؟“

تمہاری آواز عام لڑکیوں سے اونچی تھی گر اس میں جو گونج تھی وہ عام لڑکیوں کی آواز میں نہیں ہوتی۔ آواز کی یہ گونج آواز والی کی صورت کے بارے میں عموماً دھوکا دے جاتی ہے، مگر تم تو اپنی آواز کی گونج کی طرح خوبصورت تھیں۔ تم اتنی خوبصورت تھیں کہ اگر میں ایک بیوی کا شوہر اور پھر پھوٹ کا باپ نہ ہوتا، تو انعام سے کوئی خوف کھلتے بغیر ایک سخور آدمی کی طرح تم سے پہلی بات ہی یہ کہتا کہ لڑکی مجھے تھے سے محبت ہو گئی۔

مگر میں نے کہا: ”میں وقارِ جہانی سے ملنے آیا ہوں۔ میرا نام صدیق احمد ہے۔“
تب تم چونکیں اور مسکرائیں۔ یہ دہی مسکراہٹ تھی جسے مجھے جیسے آدمی نے بھی ہونٹوں سے آنکھوں تک اور آنکھوں سے کانوں کی لوتوں تک سفر کرتے دیکھا۔

تب تم نے کہا تھا: ”ارے! صدیق انکل؟ ڈھاکے والے؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا تو تم بولیں: ”آداب صدیق انکل۔ میں غالباً ہوں۔“
اور یہ کہ کہ تم وقارِ جہانی کو اطلاع دینے لان پر سے یوں تیرتی ہوتی سی گزر گئیں کہ مجھے تمہارے بازوں پر پردن کا گمان ہونے لگا۔

پھر میں وہیں تمہاری کوٹھی کے ایک کمرے میں رہنے لگا۔ آج یہ سطریں بھی اسی کمرے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آئندہ بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ اس کوٹھی کے کمروں میں تمہاری آواز کی گونج بند ہے۔ میں اس کوٹھی کے چکتے دمکتے فرش پر تمہارا ایک ایک نقش قدم گن سکتا ہوں۔ مجھے یہ تک معلوم ہے کہ تم کا بچ جانے کے لئے جبکہ میرے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہو تو اپنی ملکوں کو کتنا بار جھیکتی ہو۔ تمہیں بھی یہ معلوم نہ ہو گا کہ تمہارے ایک کان کی دو کے قیچی پے سوئی کی نوک کے برابر ایک تل ہے۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے، میں نے تمہیں پڑھا ہے، میں نے تمہیں رٹ رکھا ہے۔

تم کہتی ہو گی صدیق انکل کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم یہ کبھی نہیں سوچو گی کہ تم نے صدیق انکل کا کیا کر دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے اکیس بائیس برس کے فاصلے پر پا تھے ہو اور میں تمیں بعض کی ایک وحش کے فاصلے پر دیکھتا ہوں۔ قرب کا یہ تصور ان لوگوں کے نزدیک بے معنی ہو سکتا ہے جنہوں نے کبھی محبت نہ کی ہو۔ اور کی ہو، تو یونہی چیز سی جیسے دودھ میں ابال آتا ہے، مگر تم یقیناً سمجھ جاؤ گی، کیونکہ تم نے محبت کی ہے۔ مجھ سے نہیں کی تو کیا ہوا۔ کسی سے تو محبت کی ہے۔

ظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے کہ ایک آدمی جو ادھیر عمر میں داخل ہو چکا ہے، ایک ایسی لڑکی سے محبت کرے جس نے بھر لیا شباب میں ابھی قدم رکھا ہو۔ یقیناً ظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے۔ پھر حب اس کی عمر لڑکی کے باپ کے برابر ہو اور جسے لڑکی ”انکل“ کہ کر پکارتی ہو، تو ایسی محبت شرمناک ہی کہلا سکتی ہے، مگر میں آج تمہارے سامنے اپنی اس شرمناک محبت کا اعتراض کرنے آیا ہوں۔

عالیہ: میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ سمجھو میں آنے والی بات نہیں ہے امگر ہر بات کا سمجھو میں آجائنا ضروری تو نہیں ہوتا۔ ہم خدا کو نہیں سمجھتے، مگر اسے مانتے ہیں، تمیں مانتا ہو گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ جواب میں تمیں مجھ پر محبت نہیں آئے گی، ترس آئے گا۔ شخصتہ بھی آسکتا تھا، مگر صرف آج سے پھر ہیمنے پہلے جب تم نے محبت نہیں کی تھی اب تو تم نے محبت کی ہے اور جس طرح ساون کا بادل ٹوٹ کر برستا ہے، اسی طرح تم نے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور جو محبت کرتا ہے اسے غصہ نہیں آتا۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ تمیں مجھ پر ترس آئے گا۔

تم میرے ایک عزیز دوست کی بیٹی ہو جو میرا محسن بھی ہے۔ مجھے تم سے محبت نہیں کرنا چاہیئے تھی، مگر محبت تو زندگی اور موت کی طرح بے ساختہ چیز ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہیں جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، زندہ رہتا ہے اور مر

جاتا ہے، اسی طرح محبت کرنے لگتا ہے۔ مجھی کو دیکھو، آخر مجھے کیا پڑی تھی کہ ایک نیک، مسلیقہ شعار اور قبول صورت یہوی کا شوہر اور ساتھ ہی چھپیارے پتوں کا باب ہوتے ہوتے میں پھیلیں، بوس کے فوجوں کی طرح راتیں آنکھوں میں کاٹ دوں اور صبح کوبتر سے یوں ہلکا چھلکا اٹھوں صیئے خوب لگری نیند سویا ہوں۔ اگر محبت کرنے میں نیت کا داخل ہوتا، تو میں تم سے محبت نہ کرتا۔ سو عالیہ! میں بالکل بے بس ہوں۔ سارا اقصور تھا را ہے کہ تم ناقابل برداشت حد تک خوبصورت ہو۔ جس طرح تم کہہ سکتی ہو کہ اگر میں خوبصورت ہوں تو اس میں میرا کیا اقصور ہے، اسی طرح میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے تم سے محبت کی ہے تو اس میں میرا اقصور کیا ہے۔

اس روز جب وقار بھائی تمہارے لئے آتے ہوئے ایک پیغام کا مجھ سے ذکر کر رہے تھے، تو میں ان کی زبان سے یہ سن گردم بخود رہ گیا کہ تم میں صرف ایک کمی ہے اور وہ کمی یہ ہے کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔ میرا جی چاہا۔ میں ان سے کہہ دوں کہ وقار بھائی، آپ کی بنیانی کب سے چھن گئی؟ آپ اندھے کب ہوئے؟ آپ کی آنکھیں کب پھوٹیں؟ یہ سب سوال میرے ذہن میں آتے، مگر ان سے نہ پوچھ سکتا۔ پوچھ سکتا تو بھی نہ پوچھتا۔ اس لئے کہ اگر ایک بار میں تمہاری خوبصورتی کا ذکر شروع کر دیتا، تو پھر میری زبان کو میری موت ہی روک سکتی تھی۔ باپ کے سامنے بیٹی کے حسن کی تعریف ہمارے معاشرے میں صرف وہی لوگ برداشت کرتے ہیں جو اس معاشرے کے معیاروں سے بہت نیچے گر جاتے ہیں یا بہت اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اور میں اگر صرف تمہارے ہونٹوں کے حسن کا ذکر چھیر دوں، تو کیا ایک دن یا ایک سال یا ایک صدی میں بھی ان کے گوشوں میں دھڑکتی ہوئی مخصوصیت اور ان کے خطوط میں خم کھاتی ہوئی شوخی اور ان کے اچھوٹے پن کی جگتی ہوئی شادابی کا جائزہ مکمل کر سکوں گا؟ تم نے کبھی اپنے ہونٹوں پر خود کیا ہے عالیہ؟

تم اپنے آباجان کی نظر میں خوبصورت نہیں ہو۔ میں ہر معاملے میں تمہارے آباجان پر رشک کرتا ہوں، مگر اس معاملے میں مجھے ان کی ناسک بھی پر رحم آتا ہے۔ انہیں شکایت حقی کو صرف تمہاری صورت کی وجہ سے تمہارے لئے اب تک کوئی اچھا پیغام نہیں آیا۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ مانگا تھا اور میں نے کہا تھا کہ عالیہ سے بھی تو مشورہ کر لجھئے۔ انہوں نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا تھا اور کہا تھا: ”جی ہاں، زمانہ تو ایسا ہی آگیا ہے، مگر عالیہ میری بیٹی ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے ذہن میں بی۔ اسے کامتحان امتیازی طور پر پاس کرنے کے سوا کوئی جذبہ نہیں ہے اور شادی کے معاملے میں اس کی کوئی پسند ہو ہی نہیں سکتی۔“

میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ زمانہ ہزار ترقی کر جاتے اور علوم ہزار آگے بڑھ جائیں اور روایات ہزار ٹوٹیں، باپ سادہ لوح کے سادہ لوح ہی رہیں گے۔ وہ بیٹی کو صرف اسی خوبی میں دیکھ سکیں گے جس میں وہ ان کے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچیں گے کہ انسانی جسم و فہریں کی ساخت ہر جگہ کیساں ہے اور جذبہ قید نہیں ہو سکتا اور دنیا کی ہر لڑکی کسی نہ کسی باپ کی بیٹی ہوتی ہے، مگر ہر باپ دوسرے کی لڑکی کے بارے میں جو کچھ سننا، کہتا اور اندازے لگاتا ہے، وہ اپنی بیٹی کے بارے میں نہ سُن سکتا ہے، نہ کہہ سکتا ہے، نہ اندازے لگا سکتا ہے۔ انسان بعض اوقات کتنا حماقت کی حد تک خود غرض نظر آتا ہے۔

جب میں نے ان پر زور دیا، تو وہ مان گئے، مگر اس شرط پر کہ تم سے اس پیغام کا ذکر مجھے کرنا ہو گا۔ یعنی میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے پوچھنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا کہ تم کس سے محبت کرتی ہو۔

جب تم کا لمح سے واپس آئیں، تو میں تمہارے پیچھے پیچھے ہو لیا اور جب تم نے اپنے کمرے میں جا کر پینگ پر اپنی کتابیں پھینکیں اور دو پتہ اتار کر تپانی کی طرف

اُپھال دیا اور ایک اتنی لمبی انگوٹھی لی کہ میں حیران تھا تم نے اتنی دیر تک اپنی سانس کو کیسے رد کے رکھا، تو میں نے تمہارے دروازے کے پاس آگر اور ایک طرف ہو کر بکی سی دستک دی۔ تم نے پوچھا «کون؟»

اور مجھے تمہاری آواز کی وہ گونج یاد آگئی جو میں نے پہلے دن تمہارے فرمائی تھی۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے کچھ کہے بغیر دہان سے بھاگ جانا چاہیئے۔ اس کوٹھی سے، اس شہر سے بھاگ جانا چاہیئے تاکہ وہ چھوٹوں جو میرے ذہن میں کھلا ہے مر جھلنے نہ پائے۔

مگر پھر تم باہر آگئیں اور تم نے کہا: «انکل!» پھر تم میرے چہرے کا زانگ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اس وقت میں نے تمہارے چہرے کے آنکھیں میں اپنے چہرے کا زانگ دیکھ لیا تھا۔ «کیوں انکل؟» تم نے کہا تھا: «آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا،»

میں تمہیں کیسے بتانا کہ میں اپنی محبت کے کھنڈر میں نے انکل کر تمہاری محبت کی تغیریں تمہارا ساتھ دینے آیا ہوں۔ میں فوراً تمہارے گھرے میں چلا آیا اور میں نے جلدی جلدی سے بونا شروع کر دیا جیسے میں کوئی اداکار ہوں اور اپنے رٹھ ہوتے مکالمے دو ہزار ہا ہوں۔ «عاليہ تمہیں بھجو پر اعتماد ہے نا، تم اپنے انکل کو اپنا دوست بھی سمجھتی ہو نا؟»

اور تم نے کہا تھا: «دوست! میں تو آپ کو اپنے ابو کے برابر سمجھتی ہوں انکل!»

تب میرا زانگ کچھ اور اڑ گیا، کیونکہ تم گھبرا کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ پانے لے لیا اور جب تم نے میری آنکھوں میں فی کی تھہ دیکھی تو تم بے قرار ہو گئیں اور تم نے کہا: «نہیں انکل! اروتے گا نہیں۔ پہلے مجھے بتائیے کہ بات کیا ہے۔ آپ اپنی بھتیجی کو اپنی دوست بھی سمجھتے ہیں نا، پھر مجھے بتلتے کیوں نہیں؟ کیا میں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں انکل؟» تب تم نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور کہا: «میں دس تک گفتگی ہوں۔ جب تک آپ نے آنسو پی لئے تو ٹھیک ورنہ پھر میں بھی روٹے گوں گی۔ اول تو روٹی نہیں ہوں،

لیکن اگر رونے لگوں تو میرا پر وگرام بہت لمبا ہوتا ہے۔ لمحے میں گفتگی ہوں۔ ایک دو تین ٹھیک چھترم رک گئی تھیں کیونکہ میں تمہارے سر پر ہاتھ پھر رہا تھا اور میں تمہاری ہی قسم کھا کر کھتا ہوں کہ یہ تمہارے انکل کا ہاتھ تھا۔ میرے دل میں تمہارے لئے محنت تھی اور میرے ہاتھ میں تمہارے لئے شفقت تھی۔ تم کو لوگی انسان ایک ہی لمحے میں اپنے آپ کو دشمنیوں میں کیسے بانٹ سکتا ہے اور میں کھتا ہوں کہ انسان اپنی ذات میں ایک جہاں ہے اور اس جہاں میں پہاڑ اور جنگل، سمندر اور میدان، باول اور ستارے، صحراء اور دلیں، غرض کیا کچھ نہیں ہے!

یہ چند لمحے، جب تم میرے سینے پر سر رکھے ہوئے بیٹھی رہیں، میری محنت کا سب سے بڑا انعام تھے۔ تم سے میرے سارے مطالبات اس نقطے پر ہی پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد جب میں نے تمہیں بتایا کہ تمہارے لئے افضل کام پیغام آیا ہے۔ مگر تمہارے آباجان اس پیغام سے خوش نہیں ہیں تو تم ترپ کر اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ پھر تم شرما کر بیٹھ گئی تھیں اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس رشتے کے بارے میں تمہاری کیا راستے ہے۔

تم نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا اور تم زار زار رونے لگی تھیں۔ اور تم نے میری منت کی تھی کہ میں کسی کو بتاؤں نہیں کہ تمہیں افضل سے بے پناہ محنت ہے۔ وہ تم نے ہی فضل سے کہا ہے کہ وہ تمہارے آباجان کو ہاتھ اعدہ پیغام بھجوائے اور اگر وہ انکار کر دیں تو تم دونوں اکٹھا مر جاؤ۔

یہ چند لمحے جو تم نے اپنی محنت کے ذکر میں گزارے، میری محنت کی سب سے بڑی مسرت اور سب سے کڑا کرب ہیں۔

عالیہ امیں نے تم سے محنت کی ہے نا۔ میں نے تم سے بڑی بھرپور، بڑی احتجانہ محنت کی ہے۔ یہ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ میں تمہاری خاطر تمہارے خاندان

سے لڑتا رہا ہوں۔

میں نے جب وقار بھائی کو بتایا کہ تمیں افضل کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو وہ آپ سے باہر ہو گئے اور تمیں یے نقطہ نظر نہیں لے لے گے۔ انہوں نے کہا کہ میں ہی جاکر تمیں بتاؤں کہ افضل ایک سمحومی یعنی غریب خاندان کا ایک عام ساکویا اوس طور پر جس کا آدمی ہے، اور تم تین ہزار ماہانہ پانے والے ایک امیر آدمی کی بیٹی ہو اور تمیں متوسط طبقے کی رکھیوں کا ساکوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیتے اور مستقبل کی ترازوں میں اپنا فرع نقصان مانشے اور رتی کی حد تک قول لینا چاہیتے۔

یہ کتنی عجیب صورت حال تھی عالیہ! میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تمیں یہ کہنے کے لئے تمہارے پاس بھیجا جائے تھا کہ تم جس سے محبت کرتی ہو، اس سے محبت کرنا چکھوڑ دو! بھلماں میں ایسا کیسے کہہ سکتا تھا! میں نے محبت نہ کی ہوتی، تو شاید کہہ دیتا، مگر میں نے تو محبت کی تھی اور میری اس محبت کا تعاضا یہ تھا کہ میں تمہاری محبت کو حادثہ نہ بننے دوں۔ سو میں نے تم سے کہا تھا کہ وقار بھائی نہیں مانتے، مگر انہیں امنا پڑے گا درستہ اپنی بیٹی کے انفل سے بھی باختہ دھو لینے پڑیں گے۔ میں نے تمیں مشورہ دیا تھا کہ تم ثابت قدم رہو اور یہ ذمہ داری میں سنبھالتا ہوں کہ تمیں افضل کی بیوی بنائ کر ذم لوں گا۔

چیرن نہ ہو عالیہ! محبت صرف انتقام لینا ہری تو نہیں سکھاتی۔ محبت تو دراصل محبت کرنا سکھاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب میں تمیں افضل سے محبت نہ جانے میں مدد مے رہا ہوں تو دراصل تم سے محبت کر رہا ہوں۔ میں جانا ہوں تم اسی قت میری حماقت پر مسکرا رہی ہو، مگر عالیہ! حماقت اور محبت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ سلیقے کافر قہے اور اس سے تمیں بھی انکار نہیں ہونا چاہیتے کہ اگرچہ میں نے تم سے احتمانہ محبت کی ہے، مگر بڑے سلیقے کی محبت کی ہے۔

کتنی دلوں اور جھگڑوں اور سخنوں کے بعد آج وقار بھائی مان گئے ہیں۔ مجھے

چاہئے تھا کہ تمیں یہ خوشخبری فوراً پہنچتا، مگر بھرمی نے سوچا کہ پہلے تمہارے نام
یہ خط لکھ دوں۔ دراصل آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں نے تم سے اپنی محبت
انہا تک بھادی ہے۔ میری سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ تمیں خوش دیکھ سکوں۔
لوگ اسے محبت کا امتحان کیسی گے، میں اسے محبت کی پہچان کرتا ہوں۔

عالیہ! میں نے تمیں حاصل کرنے کے لئے تو تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے
تو تم سے خالی خوبی محبت کی۔ صرف اس لئے کہ تم ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت ہو۔
اور اس لئے کہ تمہاری آواز کی طرح تمہاری ساری شخصیت میں ایک گونج سی ہے۔ کبھی
ایک لمحے کے لئے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ تم میری ہوتیں۔ میں ایسا سوچتا
تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں تم سے محبت نہیں کر رہا ہوں، دشمنی کر رہا ہوں۔ سو افضل
کے ساتھ تمہارے چلنے کے بعد مجھے مخدومی کا احساس قطعی نہیں تاہے گا۔ جب میں
تمہارے ساتھ محبت کئے جاؤں گا تو مخدومی کیسی؟